قال رسول الله ﷺ:

اللّٰهُمَّ عَلِّمْ مُعَاوِيَةَ الْكِتَابَ وَالْحِسَابَ وَقِهِ الْعَذَابَ.

(مسند أحمد، رقم: ۱۷۵۲)

شانِ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ

ایک شیعہ کے اعتراضات کا جواب

اور

مختصر سانحۂ کربلا: شہیدِ کربلا اور کردارِ یزید

مؤلِّف:

(مفتی) محمد یحییٰ بن عبد الحفیظ (قاسمی، ممبئی)

ناشر:

مکتبہ نعیمہ (ممبئی)

تفصیلاتِ کتاب

نامِ کتاب:.....شانِ حضرت امیرِ معاویہ رضی اللہ عنہ

اور

مختصر سانحۂ کربلا: شہیدِ کربلا اور کردارِ یزید

مؤلف:.....(مفتی) محمد یحییٰ بن عبدالحفیظ (قاسمی، ممبئی)

صفحات:.....چوہتر (۷۴)

اشاعتِ اوّل:.....جمادی الاولیٰ ۱۴۴۷ھ - نومبر ۲۰۲۵ء

تعداد:.....ایک ہزار (۱۰۰۰)

ناشر:.....مکتبہ نعیمہ (ممبئی)

قیمت:.....ساٹھ روپے (۶۰)

ملنے کا پتہ:

مکتبہ نعیمہ (ممبئی)

(مفتی) محمد یحییٰ بن عبدالحفیظ (قاسمی، ممبئی)

۹۸۱۹۸۸۶۸۳۲

فہرست

تفصیلاتِ کتاب ۲
فہرست ۳
تقریظ ۷
پیش لفظ ۱۰
جماعتِ صحابہ کے لیے حفاظت ضروری ہے: ۱۱
شیعی کا سوال: ۱۴
رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ کو ملعون اور باغی کہا، اہلِ سنّت کے منابع کی روشنی میں؟ ... ۱۴
معاویہ پر لعنت کی روایت: ۱۵
حضرت علی علیہ السلام کے مقابلے میں معاویہ کی مخالفت: ۱۵
صحابہ کی رائے معاویہ کے بارے میں: ۱۵
امام احمد بن حنبل کا قول ۱۶
پہلا اعتراض: ۱۷
پہلے اعتراض کا جواب: ۱۸
دوسرا اعتراض: ۲۲
دوسرے اعتراض کا جواب: ۲۳
تیسرا اعتراض: ۲۵
تیسرے اعتراض کا جواب: ۲۶
چوتھا اعتراض (الف): ۲۹
چوتھے اعتراض (الف) کا جواب: ۲۹

چوتھا اعتراض (ب): ۲۹
چوتھے اعتراض (ب) کا جواب: ۳۰
منقبتِ حضرت امیرِ معاویہ رضی اللہ عنہ ۳۰
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مناقب حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے فرمودات کی روشنی میں: ۳۲
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مناقب سلفِ صالحین کے اقوال کی روشنی میں: ۳۳
حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کا مختصر سوانحی خاکہ ۳۴
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد: ۳۵
دورِ خلافت: ۳۵
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کی شرعی حیثیت: ۳۶
عالمِ اسلام کا دفاع: ۳۷
آخری گزارش: ۳۹
مختصر سانحۂ کرب و بلا: ۴۱
شہیدِ کربلا اور کردارِ یزید ۴۱
پیش لفظ ۴۲
مختصر سانحۂ کرب و بلا: شہیدِ کربلا اور کردارِ یزید ۴۴
دو پیشگوئی جو حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی: ۴۴
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یزید کو ولی عہد نامزد کرنا اور اس کے وجوہات: ۴۴
بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بیعتِ یزید سے توقف یا اختلاف و تحفّظات کی وجہ: ۴۹
یزید کی تخت نشینی اور اس کی پہلی سیاسی غلطی: ۵۱
حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سفرِ کوفہ (تحریک) کا اصل مقصد اور اس کا پس منظر: ۵۵

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی یہ مہم خروج نہ تھی: ۵۸
اکابر کی اکثریت بیعت پر آمادہ کیوں ہوئی؟ ۶۰
کوفہ کے سفر کا عزم: ۶۰
آپ کو کوفہ بلانے والے: ۶۱
مسلم بن عقیل رحمۃ اللہ علیہ کوفہ میں: ۶۲
مسلم بن عقیل کا مراسلہ بھیجنے کے بعد کوفہ کے بدلتے حالات: ۶۲
یزید کا خط ابنِ زیاد کو: ۶۳
کوفہ کی حقیقی صورتِ حال کا علم اور واپسی کا ارادہ: ۶۳
حُر بن یزید سے ملاقات: ۶۴
نئی صورتِ حال کی وجہ یزید سے ملاقات کا عزم اور اس کے اسباب: ۶۴
مقتلِ کربلا اور یزید کا ابنِ زیاد کے نام مراسلہ: ۶۵
حضرت حسین رضی اللہ عنہ دمشق کے راستہ میں اور ابنِ زیاد کا مقصد: ۶۶
عمر بن سعد کی آمد: ۶۷
حُر بن یزید کی تقریر: ۶۸
خون ریز جنگ کا آغاز: ۶۹
حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت: ۶۹
سانحۂ کربلا کی ذمہ داری کس پر؟ ۷۱
حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عظیم قربانی: ۷۳
سانحۂ کربلا؛ اسباقِ تاریخ: ۷۳

بسم الله الرحمن الرحيم

تقریظ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين، وعلى آله وصحبه أجمعين، أما بعد:

زیرِ نظر دونوں رسائل جن میں حضرت امیرِ معاویہ رضی اللہ عنہ کے مناقب و مقامِ خلافت اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادتِ عظمیٰ کے حوالے سے نہایت متوازن، مستند، معتدل اور مؤثر انداز میں حقائق پیش کیے گئے ہیں، اپنے موضوع اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے علمی دنیا میں ایک خوشگوار اضافہ ہیں۔

برادرِ محترم مولانا مفتی محمد یحییٰ بن عبدالحفیظ انوری قاسمی زیدہ علماً وفضلاً نے (جن کو اللہ تعالیٰ نے بہترین علمی ذوق کے ساتھ غیرتِ دینی اور حمایتِ اسلام کا وافر حصہ عطا فرمایا ہے۔) ایسے دور میں یہ خدمت انجام دی ہے کہ جب سوشل میڈیا، مبالغہ آمیز خطابات اور ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنے والی فتنہ انگیز تحریکات نے مقدّس شخصیات کے بارے میں اُمّت کے ذہنوں میں بے اعتمادی اور انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسے ماحول میں اِن رسائل نے نہ صرف علمی اعتدال کی راہ دکھائی ہے بلکہ غیر جانب دارانہ، تحقیقی اور مدلل انداز میں حقائق کو واضح کرکے اہلِ حق کے سامنے صحیح تصویر پیش کی ہے۔

پہلے رسالے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقام و مرتبہ، ان کی خدمات، ان کی سیاسی حکمتِ عملی اور اُمّت پر ان کے عظیم احسانات کو مدلل انداز میں سامنے لاتا ہے۔ اس میں نہایت حکمت کے ساتھ اُن اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو آج کل جہالت، تعصب یا سوشل میڈیا کی مصنوعی تحقیق کی بنیاد پر پیش کیے جاتے ہیں۔ مصنف نے واضح کیا ہے کہ صحابۂ

کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت وعظمت پوری اُمّت کے لیے معیارِ حق ہے، اور یہی وہ اساس ہے جس سے دین کی حفاظت وابستہ ہے۔

رحمتِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں بہت ہی وقیع کلمات ارشاد فرمائے ہیں ان کلمات کو ہمیشہ ہر مسلمان کو مستحضر رکھنا چاہیے۔

اللهَ اللهَ في أصحابي، لا تَتَّخِذوهم غَرَضًا بَعدي، فمَن أحَبَّهم فبِحُبِّي أحَبَّهم، ومَن أبغَضَهم فبِبُغضي أبغَضَهم، ومَن آذاهم فقد آذاني، ومَن آذاني فقد آذى اللهَ، ومَن آذَى اللهَ فيُوشِكُ أنْ يَأخُذَهُ.(سنن الترمذی: ۳۸٦۲)

یعنی ”اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو، میرے صحابہ کے بارے میں، میرے بعد انہیں ہدفِ ملامت مت بنانا، جو شخص ان سے محبت کرے گا وہ مجھ سے محبت کرنے کی وجہ سے ان سے محبت کرے گا، اور جو شخص ان سے بغض رکھے گا وہ مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان سے بغض رکھے گا، اور جس شخص نے انہیں ایذاء وتکلیف پہنچائی اس نے مجھے ایذاء وتکلیف پہنچائی، اور جس شخص نے مجھے ایذاء وتکلیف پہنچائی اس نے اللہ تعالیٰ کو ایذاء وتکلیف پہنچائی، اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو ایذاء وتکلیف پہنچائی قریب ہے کہ وہ اسے اپنی پکڑ میں لے لے“۔

دوسرے رسالے میں حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی سیرتِ مبارکہ اور واقعۂ کربلا کے بارے میں پھیلے ہوئے اَفسانوں اور مَن گھڑت روایات کی پردہ کشائی کی گئی ہے، اور انتہائی حکیمانہ اسلوب میں ان کی شہادت کے حقیقی اسباب وپس منظر کو پیش کرکے اصل رہنمائی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ جذباتی بیانیے اور علمی حقیقت کے درمیان واضح فرق دکھاتا ہے، اور اس دُکھ بھری تاریخ سے وہی سبق لیتا ہے جو صحابہ کی مقدس زندگی ہمیں سکھاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ مصنفِ محترم کی اس محنت کو قبول فرمائے، اسے ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے، اور اُمّت کو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی محبّت، عظمت اور تحفظ پر مضبوطی سے قائم رکھے۔

میں بطورِ خادمِ ختمِ نبوت اِن رسائل کی اشاعت کو ایک قابلِ قدر علمی خدمت سمجھتے ہوئے دل کی گہرائی سے ان کی تحسین کرتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں افادۂ عام کا ذریعہ بنائے۔ آمین

وصلَّى الله علىٰ سيِّدنا مُحَمَّد وآله وصَحْبِه أجمعين.

محمد شاہد قاسمی
ناظم ختمِ نبوت، ممبئی

پیش لفظ

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان برگزیدہ صحابہ میں سے ہیں جن پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت، صحبت، توجہ اور دعاؤں کا ایک خاص حصہ رہا۔ آپ ان چند مقتدر، باعظمت اور بلند پایا شخصیتوں میں سے ایک ہیں جن کے احسانات ہمیشہ اُمّت پر رہیں گے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے مسلسل تگ و دَو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں اور اعتماد کا حصول، خلفائے ثلاثہ کے عہد خلافت میں اپنی قائدانہ اور مدبرانہ صلاحیتوں سے خدمتِ اسلام، مسیلمۂ کذّاب کے فتنے کی سرکوبی، پہلے بحری جنگی بیڑے کی تیاری اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت و اشاعت میں حصہ آپ رضی اللہ عنہ کے درخشندہ مناقب ہیں۔

آپ کے کارہائے نمایاں میں سب سے بڑا کارنامہ اُمّت کو خانہ جنگی اور فتنہ وانتشار کے بعد ایک مضبوط اور مستحکم نظامِ حکومت عطا کرنا ہے۔ آپ نے اپنی دور اندیشی اور سیاسی بصیرت سے ایسا نظام قائم کیا جس میں مسلم دنیا میں امن قائم ہوا، عدل و انصاف کی فضا پیدا ہوئی اور رعایا کو سکون نصیب ہوا۔ آپ کے زمانے میں اسلامی سلطنت کی سرحدیں وسیع ہوئیں، بحری بیڑے تیار کیے گئے، فتوحات کے نئے دروازے کھلے اور اسلامی تہذیب و تمدن کو جِلا ملی۔

یہ حقیقت ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کو اسلامی تاریخ کا ایک مضبوط اور کامیاب دور سمجھا جاتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس کے باوجود بعض گروہ تعصب، کجیِ فکر اور تاریخی حقائق سے لاعلمی کی وجہ سے ان کی شان میں اعتراضات کرتے ہیں اور ان کے مقام و مرتبہ کو مشکوک بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اعتراضات زیادہ تر خود ساختہ یا من گھڑت روایات پر مبنی ہیں، جنہیں علمی کسوٹی پر پرکھا جائے تو ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

اُمّت میں ہمیشہ سے یہ حقیقت مسلم رہی ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تمام تر اختلافات کے باوجود عدول و معزز ہیں۔

حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

جماعتِ صحابہ کے لیے حفاظت ضروری ہے:

جس طرح نبی کے لیے عصمت ضروری ہے، کیوں کہ اس کے بغیر نبی کے پہنچائے ہوئے دین پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح جماعتِ صحابہ کے لیے حفاظت ضروری ہے، کیوں کہ وہ خیر الاُمم ہیں اور وہ مِن وجہٍ مبعوث الی الآخرین ہیں، پس عدالت و حفاظت کے بغیر ان کے پہنچائے ہوئے دین پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، اور یہ حکم کلی کے ہر ہر فرد کا ہے ارشاد نبوی ہے: ”میرے صحابہ آسمان کے تاروں کی مثال ہیں، ان میں سے جس کی بھی تم پیروی کروگے منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔“(۱)

اسی عدالت و حفاظت کا نام ”صحابہ کا معیار حق ہونا“ ہے، جن لوگوں کے نزدیک اللہ و رسول کے علاوہ کسی کی ذہنی غلامی جائز نہیں، وہ سخت گمراہی میں ہیں، وہ سوچیں ان تک دین صحابہ ہی کے توسط سے پہنچا ہے، اگر وہی قابل اعتماد اور لائق تقلید نہیں تو پھر ان کے دین کی صحت کی کیا ضمانت ہے!

غرض صحابہ کا طبقہ اُمّت کا ایک ایسا طبقہ ہے جو من حیث الطبقہ یعنی پوری کی پوری جماعت دین کے معاملہ میں مامون و محفوظ ہے، اور وہ ہر اعتقادی گمراہی یا عملی خرابی سے پاک ہے، کیوں کہ وہ بھی مبعوث ہے۔

بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک اعرابی نے مسجد نبوی میں پیشاب کرنا شروع کردیا،

(۱) یہ حدیث چھ صحابہ سے مروی ہے اور حسن لغیرہ ہے۔

لوگوں نے اس کو لے لیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: ''اُسے چھوڑو، اور اس کے پیشاب پر پانی کی ایک بالٹی ڈال دو، فإنمَّا بُعثتم مُيَسِّرين ولمْ تُبعثوا مُعَسِّرين. کیوں کہ تم آسانی کرنے والے بنا کر ہی مبعوث کیے گئے ہو، تنگی کرنے والے بنا کر مبعوث نہیں کیے گئے۔[۲] یہ حدیث شریف صحابۂ کرام کی بعثت میں بالکل صریح اور دوٹوک ہے۔ عُلم من هذا الحديث أنَّ أمتَّه ﷺ أيضًا مبعوثة إلى الناس، فثبت له ﷺ بعثتان ألبتة. اھ (السندی)۔ (ہدایت القرآن: ۱/۴۶۵)

زیرِ نظر رسالہ ایک شیعی کے اعتراض کا جواب ہے، جس کے ذریعہ سے وہ سوشل میڈیا پر شکوک پھیلا رہے تھے۔ اور مولانا سید سلمان ندوی کو اہلِ سنّت کا نہایت بلند پایہ عالم کہہ کر یہ بات ثابت کرنا چاہ رہے تھے کہ تمام بڑے اہلِ سنّت علماء کا مسلک انہی کی طرح ہے۔ جب کہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ اور ان شیعی صاحب کے اعتراض کا پورا مدار سوشل میڈیا تھا اور اسی پر وہ لوگوں کو تحقیق کرنے کی دعوت دے رہے تھے۔ سوشل میڈیا یا ''اے آئی'' کی مدد سے اعتراض کرنے سے انھوں نے وہ گل کھلائے ہیں کہ ایسے اعتراضات بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر کر دیے جو آج تک کسی نے نہیں کیے، اور ایسے اقوال نقل کر دیے ہیں جو خالص ''اے آئی'' کی پیداوار ہو سکتے ہیں، یا روافض کے تقیہ ساز دماغ کی مَن گھڑت روایات ہو سکتی ہیں، حقیقت کی کتابوں میں ان کا کہیں ثبوت نہیں ہے۔

زیرِ نظر مختصر تحریر سے آپ حضرات کو ان اعتراض کی حقیقت معلوم ہوگی، تفصیلی جواب کے لیے آپ مفصلات کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

(۲) (بخاری کتاب الوضوء، حدیث نمبر ۲۲۰ مشکوۃ، باب تطہیر النجاسات حدیث نمبر: ۴۹)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کوشش کو قبول فرمائے، اسے خالص اپنی رضا کے لیے بنائے اور اُمّت کو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی محبّت واحترام پر قائم رکھے۔ آمین

محمد یحیی بن عبد الحفیظ

خادم التدریس مدنی مدرسہ جوگیشوری

ومفتی دار الافتاء والارشاد اندھیری

شیعی کا سوال:

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ کو ملعون اور باغی کہا، اہلِ سنّت کے منابع کی روشنی میں؟

اسلامی تاریخ میں امیر معاویہ بن ابوسفیان ایک ایسی شخصیت ہیں جن پر بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہلِ تشیع انہیں دشمنِ اہلِ بیت اور باغی تصور کرتے ہیں، جب کہ اہلِ سنّت کی کتب میں بھی ان کے بارے میں بہت سی روایات موجود ہیں جو ان کی حقیقت کو واضح کرتی ہیں۔ خاص طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ معاویہ اور ان کے رویے کو کبھی پسندیدہ قرار نہیں دیا گیا؛ بلکہ بعض مواقع پر ان کے لیے باغی اور ملعون کے الفاظ آئے ہیں۔

معاویہ کے باغی ہونے پر اہلِ حدیث، اہلِ سنّت کے سب سے معتبر منابع میں سے ایک صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہیں۔

ان میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تَقْتُلُ عَمَّارًا الفِئَةُ البَاغِيَةُ.

(صحيح بخاری، كتاب الصلح، حديث ۲۸۱۲ / صحيح مسلم، كتاب الفتن، حديث ۲۹۱۵)

ترجمہ: ”عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔“

تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمار بن یاسر کو صِفّین کی جنگ میں معاویہ کی فوج نے شہید کیا۔ لہٰذا اس حدیث کے مطابق معاویہ اور ان کے ساتھی ”فِئَةٌ بَاغِيَةٌ“ یعنی ”باغی گروہ“ قرار پاتے ہیں۔

معاویہ پر لعنت کی روایت:

اہلِ سنّت کے بڑے محدث ابن عساکر (وفات: ۵۷۱ھ) نے اپنی کتاب ''تاریخِ دمشق'' میں روایت نقل کی ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللّٰهُمَّ لا تُشبع بطنه.

(تاريخ دمشق، ج۵۹، ص۱٤۱ / صحيح مسلم، كتاب البر، حديث ٢٦٠٤)

ترجمہ: ''اے اللہ! معاویہ کے پیٹ کو کبھی نہ بھر۔''

محدثین نے واضح کیا ہے کہ یہ دعائے لعنت ہے۔ امام نووی نے کہا ہے کہ: یہ بددعا معاویہ کے لیے تھی اور یہ ان کے عمل کی وجہ سے تھی۔ (شرح صحیح مسلم، ج۱۶، ص۱۵۶)

حضرت علی علیہ السلام کے مقابلے میں معاویہ کی مخالفت:

اہلِ سنّت کے نزدیک بھی حضرت علی علیہ السلام ''خلیفۂ راشد'' اور ''امامِ حق'' ہیں۔

صحیح مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يا عمَّار! تقتلك الفئةُ الباغيةُ، تدعوهم إلى الجنة ويدعونك إلى النار.

(صحيح مسلم، كتاب الفتن، حديث ۲۹۱۵)

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ جو گروہ حضرت علی علیہ السلام کے خلاف لڑے گا وہ اہلِ نار ہیں۔ اور تاریخی طور پر یہ گروہ معاویہ کا تھا۔

صحابہ کی رائے معاویہ کے بارے میں:

اہلِ سنّت مؤرخ ابن عبدالبر اپنی کتاب ''الاستيعاب فى معرفة الأصحاب'' میں نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا: معاويةُ زنديقاً، يُظهر الإسلام ويُبطن الكفر. (الاستيعاب، ج۳، ص۳۸۳)

ترجمہ: ''معاویہ ایک زندیق تھا، اسلام کو ظاہر کرتا تھا اور کفر کو چھپاتا تھا۔''

امام احمد بن حنبل کا قول

اہلِ سنّت کے عظیم امام احمد بن حنبل سے ان کے بیٹے عبداللہ نے پوچھا: معاویہ کو صحابہ میں شمار کیا جائے؟ انہوں نے جواب دیا: لا يُقاس بمعاوية أحد من أصحاب رسول الله ﷺ. پھر فرمایا: ''معاویہ نے بہت سی بدعتیں ایجاد کیں، اور اس کے ساتھ جنگ کرنے والے علی علیہ السلام برحق تھے۔ (ابن جوزی، المنتظم فی تاریخ الملوک والأمم: ج۵، ص۱۳۸)

مندرجہ بالا روایات اور حوالہ جات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے پیشگوئی کی تھی کہ عمار کو قتل کرنے والا گروہ باغی ہوگا، اور یہ باغی گروہ معاویہ کا تھا۔

صحیح مسلم میں خود نبی اکرم ﷺ نے معاویہ کے بارے میں لعنت کی دعا کی:

''اللّٰهُمَّ لا تشبع بطنه.''

حضرت علی علیہ السلام کے مقابلے میں معاویہ اور ان کے ساتھیوں کو نبیِ اکرم ﷺ نے ''اہلِ نار'' کہا۔ بعض صحابہ اور ائمۂ اہلِ سنّت نے بھی معاویہ پر تنقید کی اور ان کے کفر و نفاق کی نشاندہی کی۔ لہٰذا اہلِ سنّت کی معتبر کتب سے یہ بات ثابت ہے کہ معاویہ نہ صرف ایک باغی تھا بلکہ رسول اللہ ﷺ کی بددعا کا نشانہ بھی بنے۔

اگر آپ حضرات واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت معاویہ کی حقیقت بیان کرنا توہین کے زمرے میں آتا ہے تو پھر سب سے پہلے ان جیّد مصنفین اور علما کے خلاف مقدمہ چلانا چاہیے جنہوں نے اپنی کتابوں اور بیانات میں معاویہ کی حقیقت کو واضح کیا ہے۔

میری تمام محترم احباب سے عاجزانہ گذارش ہے کہ براہِ کرم خود تحقیق کریں، اور اندھی تقلید میں کسی کے بہکاوے میں نہ آئیں۔ آج کے دور میں ہر چیز سوشل میڈیا پر موجود ہے، صحیح

استعمال کریں اور بڑے بڑے اہلِ سنّت علما کی ویڈیوز اور تحریروں سے استفادہ کریں۔ میں نے مولانا سلمان ندوی صاحب - جو اہلِ سنّت کے نہایت بلند پایہ عالم ہیں اور سینکڑوں کتابیں لکھ چکے ہیں - کی ایک ویڈیو کا لنک کمنٹس میں شیئر کیا ہے۔ اسے ضرور دیکھیں، ان شاء اللہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہوں گی۔ خدارا! اس معاویہ کو جسے خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "باغی" فرمایا، اصحاب رسول میں شامل کر کے دیگر صحابۂ کرام کی توہین نہ کریں۔

نوٹ: شیعی کا اعتراض ختم ہوا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

و الصلاۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم

الجواب:

صاحبِ تحریر نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر چار (۴) اعتراضات کیے ہیں:

(۱) نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو باغی کہا۔

(۲) نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دعائے لعنت فرما کر ملعون کہا۔

(۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مخالفت یہ اہلِ سنّت کے نزدیک بھی مسلّم ہے، جس کی وجہ سے وہ اور ان کے ساتھی "اہلِ نار" کے مصداق ہوئے۔

(۴) بعض اکابرِ اُمّت نے بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر تنقید کی اور ان کے کفر و نفاق کی نشاندہی کی۔

پہلا اعتراض:

پہلے اعتراض کی دلیل کے طور پر تحریر کیا:

"معاویہ رضی اللہ عنہ کے باغی ہونے پر اہلِ حدیث، اہلِ سنّت کے سب سے معتبر منابع میں

سے ایک صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہیں۔ ان میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تَقْتُلُ عَمَّارًا الفِئَةُ البَاغِيَةُ.

(صحيح بخاری، كتاب الصلح، حديث ۲۸۱۲ / صحيح مسلم، كتاب الفتن، حديث ۲۹۱۵)

ترجمہ: ''عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔''

تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمار بن یاسر کو صفین کی جنگ میں معاویہ کی فوج نے شہید کیا۔ لہٰذا اس حدیث کے مطابق معاویہ اور ان کے ساتھی ''فِئَةٌ بَاغِيَةٌ'' یعنی باغی گروہ قرار پاتے ہیں۔''

پہلے اعتراض کا جواب:

یہ بات اکثر علمائے اہلِ سنّت کے یہاں مسلّم ہے کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو شامی فوج کے ایک مشہور فرد: حضرت ابو غادیہ الجہنی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا۔ اس لیے شامی فوج کے سپاہ سالار حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو ہماری فوج نے قتل کیا ہے۔ (سنن النسائی الکبریٰ)

ابو الغادیہ رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان کتبِ حدیث میں منقول ہے کہ: ''عمار بن یاسر کو ہم اپنے اچھے لوگوں میں شمار کرتے تھے۔ صفین کے دن وہ پہلے دستے میں پیدل آگے بڑھتے ہوئے دونوں صفوں کے بیچ میں آئے تو ایک شخص نے ان کے گھٹنے پر نیزہ مارا، وہ گرے تو ان کا خود ڈھلک گیا، میں نے وار کیا تو دیکھا وہ عمار کا سر تھا۔ (المعجم الكبير للطبراني: ۳۷۳/۲۳، رجاله كلّهم ثقات)

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

''اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ظاہری معجزہ موجود ہے کہ انہیں (حضرت عمار) کو ایک ایسی جماعت قتل کرے گی جو امامِ حق کے خلاف ہوگی۔ اور یہ بات تاریخاً مسلّم ہے کہ

حضرت عمار رضی اللہ عنہ صفین میں قتل ہوئے اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت میں تھے۔ یہ بات سب سے واضح دلیل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی اپنی جنگوں میں برحق اور صائب تھے۔ ہاں! یہ الگ بات ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب اپنے اجتہاد میں معذور تھے۔"

(فتح المُلھِم شرح صحیح مسلم:۲/۲۲۰)

یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر والے جو حق اور سچ نیت لے کر شریک ہوئے تھے وہ باوجود اس حدیث کا مصداق ہونے کے معذور تھے بلکہ ماجور تھے۔ کیوں کہ وہ مجتہد تھے۔

یہاں بعض حضرات کہتے ہیں کہ: مجتہد اور باغی یہ دونوں حیثیت ایک شخص میں کیسے جمع ہو سکتی ہے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ: اجتہاد کا مطلب کیا ہے؟ فقہی بصیرت رکھنے والا کوئی بھی شخص، شرعی دلائل اور ممکنہ معلومات کے تحت کسی نئے مسئلے کے حل کی ممکنہ صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کر لے۔ اس میں اس کی فکر و نظر مغالطے کا شکار بھی ہو سکتی ہے، معلومات کی کمی بھی اجتہاد پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ کوئی عقل مند یہ اصرار نہیں کر سکتا کہ ہر مجتہد کا ہر اجتہاد ہمیشہ درست ہی ہو گا۔ اس لیے علمائے اسلام کے ہاں اصول طے ہے: المجتهد يصيب ويخطى.

جب یہ بات ثابت ہو چکی تو اگلی بات سمجھنا بھی آسان ہے۔ وہ یہ کہ اجتہاد غلط ہو جانے کی صورت میں مسئلے کی نوعیت کے لحاظ سے کوئی نہ کوئی حکم ضرور لاگو ہو گا۔ مثلاً نماز فاسد ہو جانا، یا روزہ خراب ہو جانا، یا ادائیگیِ حج سے محروم رہ جانا۔ مثال کے طور پر اگر ہوائی جہاز میں نماز کا وقت آجائے اور دو مسافر فقہاء میں اختلاف ہو جائے کہ جہاز پر نماز پڑھیں یا نہیں۔ اس

بارے میں کوئی سابق فتوی سامنے نہ ہو۔ اب ایک فقیہ نماز پڑھ لے اور دوسرا فقیہ یہ سوچ کر بیٹھا رہے کہ زمین پر سجدہ ضروری ہے، اور سجدہ نام ہے: ''وضع الجبهة على الأرض.'' ''زمین پر پیشانی رکھنے کا''۔ یہاں زمین نہیں ہے تو سجدہ بھی نہیں ہو سکتا اور سجدے کے بغیر نماز نہیں ہوگی۔ چنانچہ وہ ایئرپورٹ پر اترنے کا انتظار کرتا رہے اور نماز کا وقت نکل جائے۔ اب اگر بعد میں دیگر فقہاء بالاتفاق کہہ دیں کہ جہاز کی سطح زمین کی سطح کے حکم میں ہے، اس لیے نماز وہیں پڑھ لینی چاہیے تھی اور اس مسئلے پر اتفاق ہو جائے تو جس فقیہ نے شرعی دلائل پر غور کرتے ہوئے دورانِ پرواز نماز ادا نہیں کی۔ کیا وہ گناہ گار ہوگا؟ اس نے اپنے ایمان اور اپنی دینی سمجھ کے مطابق جسے درست سمجھا، وہی کیا۔ پس اس عمل کو اجتہاد کہا جائے گا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی مانا جائے گا کہ اس کی نماز قضا ہو گئی۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ کیا اس فقیہ کو نماز قضا کرنے والا کہیں یا مجتہد۔ نماز قضا کرنا اور اجتہاد جمع کیسے ہو گیا؟ تو کیا یہ اعتراض کچھ وزن رکھے گا؟

اسی طرح ''مجتہد'' اور ''باغی'' کو متضاد قرار دینا بالکل بے بنیاد بات ہے۔ اور مجتہدِ مُخطی کو خطا پر ماجور نہیں کہا جاتا، بلکہ اجتہاد پر ماجور کہا جاتا ہے۔ خطا کا حکم یہ ہے کہ عام حالت میں اسے گناہ گار ہونا چاہیے مگر یہاں اسے دلائل کے اشتباہ کے باعث معذور قرار دیا جائے گا۔

جہاں تک اہلِ شام یا اہلِ جمل کا تعلق ہے، ان کے مجتہد ہونے کی کوئی اور دلیل نہ ہو تب بھی اس پر ان دونوں طرف والوں کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وہ ارشادات واقدامات گواہ ہیں جو محدثین اور فقہاء نے محفوظ کیے ہیں۔ ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فریق مخالف کے خلاف فوجی طاقت بھی استعمال کر رہے ہیں جو باغیوں کے خلاف استعمال کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی فریق مخالف کے مقتولین کو بھی جنتی قرار دے رہے ہیں، جو ان کے ماجور اور مجتہد ہونے کا

اعلان ہے۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خود کسی باغی کو مجتہد مان رہے ہیں تو ہمیں بھی چاہیے کہ ان کے ارشادات کو حقیقت پر محمول کریں نہ کہ "تقیہ" پر جو کہ سادات کی صفتِ جرأت و حق گوئی کے بالکل منافی ایک گھناؤنی تہمت ہے۔

یہاں یہ بھی یاد رکھا جائے کہ اہلِ سنّت و الجماعت، مجتہد کا اطلاق فریقین کی قیادت پر کرتے ہیں جس میں زیادہ تر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔ جہاں تک عام سپاہیوں کا تعلق ہے، ان میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے، اللہ کی رضا کی خاطر لڑنے والے بھی تھے اور تعصب کے باعث برسرِ پیکار ہونے والے بھی۔ ان میں سے ہر شخص فقیہ اور عالم بھی نہیں تھا کہ وہ اجتہاد کر سکتا۔ لہٰذا فریقین میں سے ہر شخص پر مجتہد کا اطلاق نہیں ہوگا۔ پس لشکرِ شام میں جو لوگ تعصب یا نادانی کی بناء پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف صف آراء ہوئے، ان پر فقط بغاوت کا اطلاق ہوگا، اجتہاد کا نہیں، اس لحاظ سے انہیں ماجور بھی نہیں کہا جائے گا۔ البتہ چوں کہ وہ مجتہدِ مخطی کی تقلید کر رہے تھے، اس لیے ان کی خطا ان شاء اللہ قابل معافی ہوگی۔

یہ بھی ظاہری بات ہے کہ جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں متشدّد لوگ اور کچھ سبائی شامل تھے، اسی طرح اہلِ شام میں بھی وہ گروہ موجود تھا جس نے فتنے کی آگ بھڑکائی اور لوگوں کو یقین دلایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلینِ عثمان کے سرپرست ہیں۔ ایسے لوگوں کو معذور نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ وہ فتنے کی جڑ نہایت بدبخت اور سخت گناہ گار تھے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ایک بار حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے سخت بیماری کی حالت میں فرمایا تھا: "میں اس بیماری میں نہیں مروں گا۔ مجھے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم بتا گئے تھے کہ میری موت دو مؤمن جماعتوں کے درمیان قتل کیے جانے سے ہوگی۔"

(تاریخِ اوسط؛ امام بخاری: ۱/۷۹)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صفین میں دونوں متحارب فریق بہر حال اہلِ ایمان اور مخلص تھے۔

اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ طاغی، ظالم، گنہگار ہوتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ صلح کی پیشکش کے لیے اپنے اصحاب کو نہ بھیجتے اور نہ ہی حضرت حسن رضی اللہ عنہ بعد میں ان سے مصالحت فرماتے۔ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صفین سے واپسی پر فرمایا: أيها الناس لا تكرهوا إمارة معاوية، والله لو قد فَقَدتُّمُوْهُ لقد رأيتم الرؤوسَ تندر من كواهلها كالحنظل. (المصنف لابن أبي شيبة، رقم: ۳۹۰۰۹) ترجمہ: ''لوگو! تم معاویہ کی امارت (حکومت) کو ناپسند نہ کرو، قسم ہے اللہ کی! اگر تم اسے کھو بیٹھے تو تم دیکھو گے کہ سر ایسے گردنوں سے کٹ کر گرنے لگیں گے جیسے (کڑوے پھل) حنظل گرتے ہیں۔''

جب یہ سب حضرات، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو طاغی، ظالم ملعون نہیں مان رہے ہیں اور خود حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا فرمان او پر گزر چکا تو پھر کسی اور کو کیا جرأت کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف زبان طعن دراز کرے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی صحابہ خطائے اجتہادی پر ہیں اور وہ اس پر ماجور ہیں، خود صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی ان کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا، اس کی وجہ سے وہ ظالم و طاغی نہیں ہوں گے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کے بموجب مخلص مومن ہوں گے۔

دوسرا اعتراض:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر دعائے لعنت فرما کر ملعون کہا۔ استدلال کے طور پر تحریر کیا:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللّٰھُمَّ لا تُشبع بطنه.

(تاریخ دمشق، ج۵۹، ص۱٤۱ / صحیح مسلم، کتاب البر، حدیث ۲٦۰٤)

ترجمہ: ”اے اللہ! معاویہ کے پیٹ کو کبھی نہ بھر۔“

محدثین نے واضح کیا ہے کہ یہ دعائے لعنت ہے۔ امام نووی نے کہا ہے کہ: یہ بددعا معاویہ کے لیے تھی اور یہ ان کے عمل کی وجہ سے تھی۔ (شرح صحیح مسلم، ج۱٦، ص۱۵٦)

دوسرے اعتراض کا جواب:

اس میں دو باتیں ہیں: (۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا صحیح مطلب اور (۲) علّامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بول کے انتساب کے غلط ہونے کی وضاحت۔

پورا واقعہ اس طرح ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”میں بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میں ایک دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور مجھے ہلکا سا دھکا دیا اور فرمایا: ”جاؤ! معاویہ کو بلا لاؤ۔“ میں گیا اور کہا: وہ کھانا کھا رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: ”جاؤ! معاویہ کو بلا لاؤ۔“ میں گیا اور واپس آکر کہا: وہ کھانا کھا رہا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ اس کے پیٹ کو کبھی سیر نہ کرے۔“ (مسلم)

اس حدیث میں نہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ملعون کہا گیا ہے اور نہ ہی یہ دعائے لعنت ہے۔ اور نہ ہی امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو دعائے لعنت قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ابھی معلوم ہوگا؛ صاحبِ تحریر کا اس کو دعائے لعنت قرار دینا علمی خیانت اور غلط انتساب ہے۔

اولاً یہ جانیے کہ خدمتِ اقدس میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حاضر نہ ہونے میں ان کا کوئی قصور نہیں، کیوں کہ انہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے کی اطلاع ہی نہیں ہوئی تھی؟ اس لیے

وہ بددعا کے مستحق نہیں۔ ثانیاً یہ جانیے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اللّٰهُمَّ إني أتخذ عندك عهداً لنْ تُخلفَنيه، فإنما أنا بشرٌ، فأي المؤمنين آذيتُه، شتمتُه، لعنتُه، جلدتُّه فاجعلها له صلاةً وزكاةً وقربةً تُقَرِّبُه بها إليك يومَ القيامة.(صحيح مسلم، رقم: ٢٤٠١)

ترجمہ: ”اے اللہ! میں تیرے پاس ایک عہد لیتا ہوں جسے تو ہرگز نہیں توڑے گا۔ میں تو ایک بشر ہوں، پس جس مومن کو میں نے ایذا دی، اسے گالی دی، اسے لعنت کی، یا اسے کوڑے مارے، تو (اے اللہ!) ان سب کو اس کے حق میں نماز، زکوٰۃ اور ایسی قربت بنادے جس کے ذریعہ وہ قیامت کے دن تیرے قریب ہوجائے۔“

اس صورت میں یہ حدیث حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گراں قدر مناقب میں سے ہے، اور آپ رضی اللہ عنہ کے لیے باعثِ تطہیر، اجر و ثواب اور قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کا یہی مطلب سمجھا ہے۔ چنانچہ آپ نے اس حدیث کو ”باب مَن لَعَنَه النبيُّ صلی اللہ علیہ وسلم، أو سبَّه، أو دعا عليه، و ليس هو أهلاً لذلك، كان له زكاةً و أجراً و رحمةً“ کے تحت نقل کیا ہے۔

ابنِ حجر ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

إن هذا الحديث من مناقب معاوية الجليلة، لأنه بان بما قررته أنه دعاء لمعاوية لا عليه، وبه صرح النووي.

(مختصر تطهير الجنان واللسان، ص ٩٢، ط: دار علوم السنةالرياض)

ترجمہ: یہ حدیث حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عظیم مناقب میں سے ہے، اس لیے کہ یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دعائے خیر ہے، بددعا نہیں۔ اِسی کی نووی نے صراحت کی ہے۔

علّامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"لعل أن يقال: هذه منقبة لمعاوية لقوله ﷺ: اللّٰهُمَّ من لعنته أو سببته ..... الحديث." (سير أعلام النبلاء ١٣٠/١٤)

اور حافظ ابنِ عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کا یہی مطلب لیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مناقب میں اس حدیث کو صحیح ترین حدیث قرار دیا ہے۔ أصح ما روي في فضل معاوية حديث أبي حمزة عن ابن عباس (تاريخ دمشق: ١٠٢/٥٩) ابنِ عساکر سمیت ان تمام علماء کا یہ کہنا ہے کہ اس حدیث میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی منقبت ہے۔

بعض علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ: یہ الفاظ بد دعا کے ارادے سے نہیں نکلے اور یہاں اس کا لغوی معنی مراد نہیں، جیسا کہ ثَكِلَتْ أمُّك، تربتْ يداك، عقرى حلْقى، وغیرہ الفاظ میں ان کا لغوی معنی مراد نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ مُلّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

هذا دعاء لا يراد وقوعه، بل عادة العرب التكلم بمثله على سبيل التلطف.
(مرقاة المفاتيح، كتاب المناسك، باب خطبة يوم النحر)

یعنی اس کا مطلب ہے کہ ان الفاظ سے ان کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں۔ جیسے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا کہ "تیری ماں تجھ کو روئے" تو یہ محاورۃً کہا تھا اس کے حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے اسی طرح یہاں پر بھی ہے۔

تیسرا اعتراض:

"حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مخالفت یہ اہلِ سنّت کے نزدیک بھی مسلّم ہے، جس کی وجہ سے وہ اور ان کے ساتھی "اہلِ نار" کے مصداق ہوئے۔"

استدلال کے طور پر تحریر کیا:

"صحیح مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يا عمَّار! تقتلك الفئةُ الباغيةُ، تدعوهم إلى الجنة ويدعونك إلى النار.

(صحيح مسلم، كتاب الفتن، حديث ٢٩١٥)

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ جو گروہ حضرت علی علیہ السلام کے خلاف لڑے گا وہ اہلِ نار ہیں۔ اور تاریخی طور پر یہ گروہ معاویہ کا تھا۔"

تیسرے اعتراض کا جواب:

صحیح بخاری ماشاء اللہ بارہ صدیوں سے محدثین اور شراح حدیث کے ہاتھوں میں ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی اس حدیث کا یہ مفہوم سمجھ میں نہ آسکا جو آں جناب نے سمجھا ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک اس روایت کا اطلاق اہل شام ہی پر ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ ان میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی تھے تو ان پر دعوت الی النار کا اطلاق کیسے درست ہوسکتا ہے؟ تو اس کے کئی جوابات موجود ہیں۔ کسی ایک کو بھی سمجھ لیں تو صحابہ کے دین وایمان پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔

پہلا اور بے تکلف جواب یہ ہے کہ فصیح وبلیغ کلام میں ہر جگہ حقیقی معنی نہیں بلکہ بارہاں مجازی معنی بھی مراد ہوتا ہے۔ یہاں "الجنَّة" سے مجازاً امن وامان اور اتحاد واتفاق ہے۔ پُرامن جگہ کو جنّت سے تعبیر کرنا عام بات ہے۔

بہشت آں جاست کہ آزاری نباشد کسے را با کسے کارے نہ نباشد

اور جنگ کو "نار" (آگ) سے تعبیر کرنا بھی عام ہے:

﴿كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللهُ﴾ [المائدة:٦٤]

یہی مطلب بالکل صاف ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ ایسی چیز کی طرف دعوت دے رہے

تھے جس سے امن وامان قائم ہوتا، یعنی اہلِ شام بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لیتے تو مسلمان متحد ہو جاتے، جنّت جیسا پر سکون ماحول میسر آجاتا۔ اہلِ شام کا بیعت سے انکار کرنا، جنگ کا باعث بن رہا تھا۔ اگرچہ ان کا یہ اقدام مجتہدانہ تھا مگر اس کا نتیجہ آتشِ جنگ بھڑکنے کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا تھا۔ اور آخر میں یہی ہوا۔ "یدعوھم إلی الجنَّة ویدعونه إلی النار" کا یہ بے تکلف مطلب سمجھ لینے کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کے دین وایمان بلکہ اجتہاد پر بھی کوئی حرف نہیں آتا۔

دوسرا جواب حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور اہلِ علم کے ہاں بہت مشہور ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"اگر کہا جائے کہ عمار رضی اللہ عنہ کا قتل صفین میں ہوا اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور جنہوں نے قتل کیا وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ اور ان کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم کی بھی ایک جماعت تھی تو یہ کہنا کیسے جائز ہوگا کہ وہ لوگ جہنم کی طرف بلا رہے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ حضرات (اہلِ شام بھی اپنے طور پر تو یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ جنّت کی طرف بلا رہے ہیں۔) وہ سب اس معاملے میں مجتہد تھے، ان پر اپنے خیال کی پیروی میں کوئی ملامت نہیں۔ تو جنّت کی طرف بلانے سے مراد جنّت کے سبب کی طرف بلانا ہے۔ اور وہ تھا حکمران کی اطاعت۔ اسی طرح عمار رضی اللہ عنہ انہیں علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت کی طرف بلا رہے تھے، اور وہ حکمران تھے جن کی اطاعت اس وقت واجب تھی۔ اور وہ حضرات (اہلِ شام) اس کے خلاف بلا رہے تھے لیکن وہ اس تاویل کی وجہ سے معذور تھے جو ان پر ظاہر تھی۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ "یدعوھم إلی الجنَّة ویدعونه إلی النار" کا اضافہ اس حدیث میں ثابت نہیں۔ حدیث کا یہ حصہ عکرمة عن ابی سعید الخدری کی روایت میں مذکور

ہے، دوسرے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جن سے یہ حدیث مروی ہے ان سے یہ حصہ مرفوعًا مروی نہیں، ہاں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے، لیکن اس کی سند میں عبدالنور متہم بالوضع ہے۔

یہ روایت صحیح مسلم شریف: کتاب الفتن، سننِ ترمذی: مناقبِ عمار، مسندِ ابو داؤد طیالسی: تحت احادیثِ زید بن ثابت، مصنف ابن ابی شیبہ: کتاب الجمل، باب ماذکر فی صفین، خصائص علی الامام النسائی، صحیح ابن حبان، سنن نسائی، مسندِ احمد، مصنف عبدالرزاق، مسندِ ابی یعلی، مسندِ بزّار، مسندِ حُمیدی، مستدرکِ حاکم اور معاجمِ طبرانی میں موجود ہے۔ ان مقامات پر صرف ایک روایت جو عکرمہ کے ذریعے سے مروی ہے صرف اس میں "یدعوھم الخ" کا اضافہ ہے۔

نیز یہ روایت عکرمة عن ابی سعید الخدری کے علاوہ حضرت ابوقتادہ، عمرو بن العاص، ام سلمہ، خزیمہ بن ثابت، ابوہریرہ، عثمان بن عفان، حذیفہ، ابوایوب، ابورافع، ابو الیسر رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے، ان کی روایات میں "یدعوھم الی الجنة" الخ کا اضافہ نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اضافہ عکرمہ نے اپنے اجتہاد سے کیا ہے اور یہ مدرج ہے۔

اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جماعت نار کی طرف بلانے والی ہوتی تو عشرۂ مبشرہ میں سے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہما بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہم خیال تھے، تو وہ کیسے داعی الی النار ہو سکتے ہیں؟ اسی طرح حضرت جریر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی اور دیگر بعض صحابہ کیوں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہ گئے؟ کیا وہ لقب یافتہ باغیوں کے ساتھ رہے؟ یہ کیسے ممکن ہے!!

نیز ابوایوب انصاری، ابوہریرہ، اُمِّ سلمہ، ابنِ عمر اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم جو حدیث ویح عمار... کے راوی ہیں، کیوں قتال سے الگ رہے؟ ان کو تو پھر باغیوں کے مقابلے میں صف

آرا ہونا چاہیے تھا۔ اور کیوں انہی داعیوں کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کلمۂ خیر کہے؟

چوتھا اعتراض (الف):

"بعض اکابرِ اُمّت نے بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر تنقید کی اور ان کے کفر و نفاق کی نشاندہی کی۔"

اس کی دلیل میں ایک تو یہ قول نقل کیا:

(الف) "اہلِ سنّت مؤرخ ابن عبد البر اپنی کتاب الاستیعاب فی معرفة الأصحاب میں نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا: معاويةُ زنديقاً، يُظهر الإسلام و يُبطن الكفر. (الاستیعاب، ج۳، ص۳۸۳)

ترجمہ: "معاویہ ایک زندیق تھا، اسلام کو ظاہر کرتا تھا اور کفر کو چھپاتا تھا۔"

چوتھے اعتراض (الف) کا جواب:

یہ انتساب باطل ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر صریح بہتان ہے۔

بلکہ حافظ ابنِ عبد البر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے کہا گیا: تو پھر حضرت ابو بکر و عمر، اور عثمان و علی؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! یہ سب حضرت معاویہ سے بہتر تھے، لیکن معاویہ ان سے حکمرانی میں فائق تھے۔ فقيل له: فأبو بكر، وعمر، وعثمان، وعلي؟ فقال: كانوا والله خيرا من معاوية، وكان معاوية أسود منهم. (الاستيعاب في معرفة الأصحاب:۱۴۱۸/۳)

چوتھا اعتراض (ب):

صاحبِ تحریر نے دوسری دلیل کے طور پر حضرت امامِ احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا:

"اہلِ سنّت کے عظیم امام احمد بن حنبل سے ان کے بیٹے عبد اللہ نے پوچھا: معاویہ کو صحابہ

میں شمار کیا جائے؟ انہوں نے جواب دیا: لا يُقاس بمعاوية أحد من أصحاب رسول الله ﷺ. پھر فرمایا: ''معاویہ نے بہت سی بدعتیں ایجاد کیں، اور اس کے ساتھ جنگ کرنے والے علی علیہ السلام برحق تھے۔ (ابن جوزی، المنتظم فی تاریخ الملوک والأمم: ج۵، ص۱۳۸)''

چوتھے اعتراض (ب) کا جواب:

یہ نسبت بھی حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ پر بہتان ہے، اور یہ بہتان تراشی شیعوں میں معیوب بھی نہیں ہے۔

بلکہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

معاوية خال المؤمنين. (رواه الخلال في السنة، رقم: ٦٥٧، وسنده صحيح)

اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب لکھی ''كتاب فضائل الصحابة'' اس میں باقاعدہ ایک باب قائم کیا: ''فضائل معاوية بن أبي سفيان رضي الله عنهما'' اور اس باب میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کئی فضائل بیان کیے۔

بہر حال صاحبِ تحریر نے اپنا مدّعا ثابت کرنے کے لیے جو دلائل و حوالے پیش کیے ہیں سب غیر صحیح اور غیر صریح ہیں یا تو مدعی پر ان کی دلائل درست نہیں بیٹھتے ہیں یا دلائل ہی من گھڑت اور بہتان ہے۔

منقبتِ حضرت امیرِ معاویہ رضی اللہ عنہ

آئیے! اب ہم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل پر روشنی ڈالتے ہیں:

بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مناقب میں کوئی صحیح حدیث موجود نہیں۔ یہ بات درست نہیں، چند روایات یہ ہیں:

(۱) حضرت عبدالرحمن بن ابی عمیرہ -جو کہ صحابیِ رسول ہیں- سے مروی ہے کہ نبیِ

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امیرِ معاویہ رضی اللہ عنہ کو دعا دیتے ہوئے فرمایا:

اللّٰھُمَّ اجْعَلْهُ هَادِياً مَهْدِياً وَاهْدِ بِه.

ترجمہ: اے اللہ! تو معاویہ کو ہدایت کی راہ پر چلنے والا، ہدایت پر چلانے والا بنا اور اس کے ذریعے سے لوگوں کو ہدایت سے نواز۔ (۳)

(۲) صحیح بخاری میں ہے:

"اُمّت کا پہلا لشکر جو بحری جہاد کرے گا اس نے اپنے لیے جنت کو واجب کر لیا۔" (۴)

علّامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ دونوں نے اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے:

"مہلب نے فرمایا: اس حدیث میں فضیلت ہے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی، اس لیے کہ انہوں نے سب سے پہلے سمندری جہاد کیا تھا۔" (۵)

(۳) عبد الرحمن بن ابی عمیرہ رضی اللہ عنہ سے دوسری حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

اللّٰھُمَّ علِّمْهُ الكتابَ والحسابَ، وَقِهِ العذابَ.

ترجمہ: "اے اللہ! تو اسے (معاویہ رضی اللہ عنہ کو) کتاب اور حساب سکھلا، اور عذاب سے بچا۔" (۶)

---

(۳) عن عبد الرحمن بن أبي عميرة، وكان من أصحاب رسول الله ﷺ عن النبي ﷺ أنه قال لمعاوية: اللّٰهُمَّ اجعله هاديا مهديا واهد به.(سنن الترمذي، رقم: ۳۸۴۲، باب مناقب معاوية بن أبي سفيان ؓ، وقال الترمذي: هذا حديث حسن غريب)

(۴) عن أم حرام: أنها سمعت النبي ﷺ يقول: أول جيش من أمتي يغزون البحر قد أوجبوا.

(صحيح البخاری؛ كتاب الجهاد: باب ماقيل فی قِتال الروم:۲۹۲۴)

(۵) قال الْمُهَلب: في هذا الحديث منقبة لمعاوية لأنه أول من غزا البحر. (فتح الباری:۶،۱۰۲ - عمدة القاری:۱۴،۲۳۹)

(۶) عن عبد الرحمن بن أبي عميرة المزني، وكان من أصحاب النبي ﷺ أن النبي ﷺ قال لمعاوية: اللّٰهُمَّ علِّمْهُ الكتابَ والحسابَ، وَقِهِ العذابَ.(مسند الشاميين، للطبراني، رقم: ۳۳۳)

(۴) عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے اللہ! معاویہ کو کتاب اور حساب کا علم عطا فرما اور اسے عذاب سے محفوظ رکھ۔"(۷)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مناقب حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے فرمودات کی روشنی میں:

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"بیشک معاویہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھ کر لکھا کرتے تھے۔"(۸)

(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو فقیہ فرمایا:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا:

"کیا آپ امیر المؤمنین معاویہ کے بارے میں کچھ فرمائیں گے؟ وہ وِتر صرف ایک رکعت پڑھتے ہیں۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "انہوں نے ٹھیک کیا ہے، وہ فقیہ ہیں۔"(۹)

(۳) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو نہیں دیکھا جو تمہارے امیر (یعنی معاویہ) سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے مشابہ ہو۔"(۱۰)

---

(۷) اللّٰهُمَّ علم معاوية الكتاب والحساب وقه العذاب. (مسند أحمد، رقم: ۱۷۵۲)

(۸) عن عبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله عنهما قال: إن معاوية كان يكتب بين يدي رسول الله ﷺ.
(المعجم الكبير للطبراني ١٤٤٤٦/١٣/٥٥٤)

(۹) قيل لابن عباس: هل لك في أمير المؤمنين معاوية، فإنه ما أوتر إلا بواحدة؟ قال: أصاب إنه فقيه.
(صحيح البخاري، رقم: ٣٧٦٥، باب ذكر معاوية رضي الله عنه)

(۱۰) ما رأيت أحداً بعد رسول الله ﷺ أشبه صلاة برسول الله من أميركم هذا يعني معاوية.
(رواه البغوي في معجم الصحابة، رقم : ٢١٩٠)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مناقب سلفِ صالحین کے اقوال کی روشنی میں:

(۱) حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اگر تم صبح اٹھو اور تمہارا عمل معاویہ جیسا ہو، تو تم میں سے اکثر یہ کہے گا کہ یہ تو ہدایت یافتہ ہے۔"(۱۱)

(۲) زہری کہتے ہیں کہ سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے فرمایا:

"اے زہری! سنو! جو شخص اس حال میں مرے کہ وہ ابو بکر، عمر، عثمان اور علی سے محبت رکھتا ہو، عشرۂ مبشرہ کے لیے جنّت کی گواہی دیتا ہو اور معاویہ کے لیے رحمت کی دعا کرتا ہو، تو اللہ پر حق ہے کہ وہ اس سے حساب نہ لے۔"(۱۲)

(۳) امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عدول، فضیلت والے اور برگزیدہ صحابہ میں سے ہیں۔"(۱۳)

یہ نقول واقوال بطور نمونہ کے لکھے گئے ہیں ذخیرہ اس سے کافی مستزاد ہے۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الحقَّ حقّاً وَارْزُقْنا اتِّباعَه وَاَرِنا الباطلَ باطِلاً وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَه

---

(۱۱) لو أصبحتم في مثل عمل معاوية لقال أكثركم: هذا المهدي. (رواه الحلال في السنة، رقم : ٦٦٨)

(۱۲) عن مالك عن الزهري قال: سألت سعيد بن المسيب عن أصحاب رسول الله ﷺ فقال لي: اسمع يا زهري مَن مات مُحِبّاً لأبي بكر وعمر وعثمان وعلي وشهد للعشرة بالجنة وترحَّمَ على معاوية كان حقيقاً على الله أنْ لا يناقشه الحسابَ. (تاريخ دمشق لابن عساكر ٥٧/٢٠٧، وإسناده صحيح)

(۱۳) أمّا معاوية رضي الله عنه فهو من العدول الفضلاء والصحابة النجباء رضي الله عنه.
(شرح النووي على مسلم:١٥/١٤٩)

حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کا مختصر سوانحی خاکہ

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ قریش کے خانوادے، بنواُمیہ کے نہایت باصلاحیت اور ہونہار فرد تھے۔ آپ کے والد حضرت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ اور والدہ ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا نے فتحِ مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا جب کہ آپ اس سے پہلے سن ۷ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرۂ قضا کے وقت خفیہ طور پر مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً اٹھارہ سال تھی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ طویل قد وقامت اور گوری رنگت والے نہایت خوبصورت انسان تھے۔ بچپن ہی سے آپ رضی اللہ عنہ میں قیادت کے جوہر اتنے نمایاں تھے کہ قیافہ شناس لوگ کہتے تھے: اللہ کی قسم! یہ بچہ اپنی قوم کا رہنما بنے گا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ قریش کے گنے چنے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں شمار ہوتے تھے۔ فتحِ مکہ کے بعد وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب مقرر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے عرب رؤسا کے نام خطوط لکھواتے اور وحی کی کتابت بھی کراتے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو تین سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب نصیب رہا اور بہ کثرت احادیث سننے اور نقل کرنے کا موقع ملا۔ ان سے ایک سو تریسٹھ (۱۶۳) احادیث مروی ہیں۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمات سے خوش ہو کر دعائیں دیا کرتے تھے۔ ایک بار یہ دعا دی: ”اے اللہ! اسے ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ بنا دے اور اس کے ذریعے ہدایت عام فرما“۔

ایک بار آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ”معاویہ اگر تمہیں حکومت کا ذمہ دار بنایا جائے تو اللہ سے ڈرتے رہنا اور عدل وانصاف سے کام لینا۔“

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وجہ سے (جو بلاشبہ ایک پیش گوئی تھی) مجھے برابر یہ خیال رہا کہ مجھے حکومت کی آزمائش میں ضرور مبتلا کیا جائے گا اور آخر مجھے اس سے سابقہ پڑ کر رہا۔''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے بڑے بھائی یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے ساتھ شام کی فتوحات میں شریک رہے اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ شام کی فتح مکمل ہونے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو اس سرزمین میں اپنا نائب مقرر کیا۔ یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو شام کا حاکم بنادیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سمندری جہاد شروع کیا اور متعدّد علاقے فتح کیے۔

خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ کی صلاحیتوں پر پورا اعتماد تھا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: تمہیں قیصر و کسریٰ کی حکمرانی کے تذکرے کی کیا ضرورت، جب کہ تمہارے درمیان معاویہ موجود ہیں۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''میں نے معاویہ سے بڑھ کر حکمرانی کے قابل کوئی اور نہیں دیکھا۔''

دورِ خلافت:

ربیع الاول سن ۴۱ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے متفقہ خلیفہ کی حیثیت سے مسندِ خلافت پر بیٹھے تو عالمِ اسلام میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا، مخلص مسلمانوں کے تمام طبقات یکجا ہو گئے۔ آپ نے مدینہ یا کوفہ کی بجائے دمشق کو دار الخلافہ قرار دیا۔ اس کے بعد (دورِ خلافتِ زبیر رضی اللہ عنہ کو مستثنیٰ کر کے) ۸۲ برس تک مرکزِ خلافت شام میں رہا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کی شرعی حیثیت:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت مخلص مسلمان تین طبقوں میں بٹے ہوئے تھے: پہلا طبقہ شام والوں کا تھا، جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے وفادار تھے۔ دوسرا طبقہ عراق کے مسلمانوں کا تھا جو حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے یہ بیعت کر چکے تھے کہ آپ جس سے صلح کریں گے، ہم بھی اس سے صلح کرلیں گے۔ تیسری جماعت غیر جانبدار تھی، جن میں حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت محمد بن مَسلمہ، حضرت اسامہ بن زید، حضرت سَلمہ بن اَکوَع اور حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت کا منصب چھوڑ دیا تو عراق کے مخلص مسلمانوں نے بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت کرلی۔ ان میں حضرت میں قیس بن سعد رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جیسے اکابر بھی تھے۔ غیر جانب دار طبقے نے سب کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر متفق دیکھا تو انہوں نے بھی بیعت کرلی۔ اس طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو مسلمانوں کے تمام طبقات اور تمام گروہوں کی تائید نصیب ہوئی اور اس سال کا نام ہی ''عام الجماعة'' (اجتماعیت اور اتحاد کا سال) پڑ گیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت برحق اور شرعی تھی۔ ہاں! اس سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت نہ کرنا اور شام پر اپنی آزاد حکومت قائم رکھنا (ان معاملات میں حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا اور) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ایک اجتہادی غلطی تھی جس میں ان کی نیت بالکل صاف تھی، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جانشین حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور ان کے پیروکاروں سمیت تمام مسلمانوں کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مان لینے کے بعد ان کی خلافت کو غیر آئینی کہنا انصاف سے بعید ہے۔

عالمِ اسلام کا دفاع:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جہادی سلسلہ پوری آب و تاب سے چلا۔ آپ ہمیشہ ایک کہنہ مشق سپہ سالار اور عسکری منصوبہ ساز تھے۔ آپ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو مصر، حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو بصرہ اور حضرت مسلمہ بن مَخلد رضی اللہ عنہ کو افریقہ کا حاکم مقرر کیا۔ یہ سب مانے ہوئے سپہ سالار اور سیاست دان تھے۔ انہوں نے بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ مشرق و مغرب میں اسلامی افواج کو آگے بڑھایا جس کے نتیجے میں شورش پسندوں کا صفایا ہوا اور ہر طرف اسلامی افواج کے قدم جم گئے۔

برِّصغیر میں ہندوستان کی سرحدوں: سندھ اور بلوچستان میں کئی جہادی مُہِمّات پیش آئیں۔ خراسان میں مزید پیش قدمی ہوئی۔ حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے ایک بہت طویل مہم کے بعد کابل تک کو مسخر کر لیا۔ وسطِ ایشیا میں اُمّتِ محمدیہ کا پہلا جہاد ہوا اور اُزبکستان کے کئی علاقے فتح ہوئے۔ حضرت سعید بن عثمان یہاں کے سپہ سالار مقرر ہوئے جنہوں نے بخارا، سمرقند اور ترمذ کو فتح کر لیا۔ افریقہ میں بھی فتوحات ہوئیں اور رومیوں کی قوت کو بھی کمزور کر دیا گیا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بیس سال خلیفہ اور بیس سال گورنر رہے۔ کل تقریباً چالیس سال حکمرانی کی۔ ان کی وفات رجب ۶۰ھ میں ہوئی۔ بعض روایات میں ۵۹ھ یا ۷۸ یا ۸۲ سال عمر مذکور ہے، لیکن مشہور قول یہی ہے کہ ۶۰ھ میں ۷۸ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔

وفات کے وقت انہوں نے وصیت کی کہ انہیں وہی قمیص پہنائی جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں عطا کی تھی، اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناخن مبارک ان کے پاس تھے، انہیں پیس کر ان کی آنکھوں اور منہ میں رکھا جائے۔ انہوں نے کہا: ”ایسا کرو اور مجھے اللہ کے حوالے چھوڑ دو“۔

وفات کے وقت فرمایا: ”کاش میں قریش کا ایک عام آدمی ہوتا اور کبھی حکومت کا بوجھ نہ اٹھاتا“۔

نمازِ جنازہ ضحاک بن قیس نے پڑھائی، کیوں کہ اس وقت یزید (بیٹے) موجود نہ تھا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وجیہ، خوبصورت اور سفید رنگ والے تھے، ہنستے وقت اوپر کا ہونٹ پلٹ جاتا تھا۔ بالوں کو رنگا کرتے تھے۔

جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو ضحاک بن قیس نے ان کے کفن اٹھائے منبر پر چڑھ کر لوگوں کو خطاب کیا اور کہا:

”امیر المؤمنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عرب کے ستون و محافظ اور عرب کا سہارا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے فتنے کو ختم کیا، انہیں بندوں پر حکمرانی عطا کی، اور ان کی فوجوں کو خشکی اور سمندر میں روانہ کیا۔ وہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ تھے، اللہ نے انہیں اپنی طرف بلایا تو انہوں نے لبیک کہا اور اپنی عمر پوری کی۔ یہ ان کے کفن ہیں، ہم انہیں ان میں لپیٹ کر قبر میں اتاریں گے اور چھوڑ دیں گے، اور اب ان کا عمل ان کے اور ان کے رب کے درمیان ہے، چاہے تو اللہ ان پر رحم فرمائے اور چاہے تو عذاب دے۔“

(ماخوذ از آئینۂ تاریخِ اُمّت و اسد الغابۃ)

ان ہی سب کارہائے نمایاں، کمالات اور اسلامی خدمات کی بنا پر اسلام دشمنوں نے بالخصوص سبائیوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کردار کو مشکوک کیا اور جھوٹے اور مَن گھڑت اعتراضات کے طومار سے ان کی شخصیت اور کردار کو داغدار کرنا چاہا۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم لکھتے ہیں:

”حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا دورِ حکومت تاریخِ اسلام کے درخشاں زمانوں میں ہے جس میں اندرونی طور پر امن و اطمینان کا دور دورہ بھی تھا اور ملک

سے باہر دشمنوں پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی لیکن ان کے مخالفین نے ان پر اعتراضات والزامات کا کچھ اس انداز سے انبار لگایا ہے کہ تاریخ اسلام کا یہ تابناک زمانہ سبائی پروپیگنڈے کے گرد وغبار میں روپوش ہوکر رہ گیا ہے۔"

اس تمام تر شرف وفضل کے ساتھ ساتھ آپ رضی اللہ عنہ دنیائے اسلام کی وہ واحد مظلوم ہستی بھی ہیں کہ جن کی تمام خوبیوں، ذاتی محاسن وکمالات اور عظیم کارناموں کو فراموش کر دیا گیا، جن کے قابلِ احترام رشتوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا، جن کے فضائل ومناقب زبان پر لانے کو بھی گناہ عظیم تصور کیا گیا، جن کے ایمان کو نفاق، سخاوت کو خیانت، خشیتِ الٰہی کو ریاکاری، تدبیر وسیاست کو مکر وفریب اور عدل وانصاف کو ظلم کا نام دیا گیا۔ حتیٰ کہ جن کی موت کو بھی نفاق اور عیسائیت کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔

آخری گزارش:

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے لیے سوشل میڈیا کے بجائے قرآنی اصول، احادیثِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ صحیح مستند معتبر علمائے دین کی کتابوں سے استفادہ کیا جائے۔

اس باب میں معاون چند اردو کتابوں کا نام ذیل میں لکھا جاتا ہے:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق (از مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم)

تاریخ اُمّتِ مسلمہ (از مولانا اسماعیل ریحان)

سوانحِ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ (از مولانا نافع صاحب)

سوانحِ معاویہ رضی اللہ عنہ (از مولانا یحییٰ نعمانی)

مختصر سانحۂ کرب و بلا:

شہیدِ کربلا اور کردارِ یزید

پیش لفظ

اس مرتبہ عشرۂ محرم کی تقاریر (وعظ) شرکت کیے بغیر سننے کا موقع ملا، دھواں دار مقرر مفتی بریلوی کی آواز گویا ابھی بھی کانوں میں گونج رہی ہے، اس سماعت سے مجھے اندازہ ہوا کہ کیسی ہوائی اور تخیّلی باتیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں پھیلائی جارہی ہیں، اسلام اور مسلمانوں میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شخصیت جو عظمت و اہمیت، شہرت وقبولیت اور تقدُّس وفضیلت رکھتی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں لیکن ان کی زندگی اور کارناموں پر اَفسانہ واَفسوں کی چادر پڑی ہوئی ہے۔

افسوس کہ افسانہ گھڑنے والوں نے اُن کی روشن سیرت پر اس طرح افسانوی رنگ چڑھا دیا ہے کہ اُن کے حقیقی کارنامے اور اخلاقی دروس نظر سے اَوجھل ہوتے جارہے ہیں۔ دوسری طرف کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یزید کا مرتبہ بڑھاکر مقامِ حسین کے بیان میں تقصیر سے کام لیتے ہیں اور اس عظیم المرتبت شخصیت کا پورا حق ادا نہ کرتے ہوئے یزید کو پورے واقعے سے اس طرح شفّاف نکالتے ہیں جیسے تیز رفتار تیر شکار سے صاف نکل آتا ہے۔

اِسی پس منظر نے قلم کو یہ تحریک دی کہ حقائق کو ان کے اصلی، صاف اور منقّح شکل میں پیش کیا جائے۔ مختلف اردو کتب اور رسائل کے مطالعے کے بعد ''تاریخِ اُمّتِ مسلمہ'' اور اس کا اختصار ''تاریخ آئینۂ اُمّت'' نہایت معتدل، محقّقانہ اور جامع ماخذ کے طور پر سامنے آئے۔ چنانچہ انہی کے سہل، واضح، معتمد ومعتبر اور مربوط اسلوب کو سامنے رکھتے ہوئے اِس عاجز نے ان مضامین کا مزید اختصار، خلاصہ اور مَغز تیار کرکے قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کی ہے؛ تاکہ فائدہ عام ہو، فہم آسان ہو اور حقیقت بے غبار ہو۔

اور تاکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا پیش منظر وپس منظر سے اہلِ مطالعہ کے سامنے ایک واضح اور صحیح نقشہ آجائے، اور وہ اس مقدس واقعے سے وہی رہنمائی حاصل کریں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر اُمّت کو سکھائی۔

ہم نے اِن ہی دونوں کتابوں پر اعتماد کرتے ہوئے حوالہ لکھنے سے اِعراض کیا ہے، اگر کسی کو ہر ہر قول وواقعہ کا حوالہ درکار ہو تو ان دونوں کتابوں کی طرف رجوع کرے۔

اللہ تعالیٰ اِسے قبول فرمائے اور اِسے اہلِ حق کے لیے بصیرت وہدایت کا ذریعہ بنائے۔ آمین

محمد یحییٰ بن عبدالحفیظ انوری، قاسمی

مختصر سانحۂ کرب وبلا: شہیدِ کربلا اور کردارِ یزید

دو پیشگوئی جو حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی:

۱. میرا یہ بیٹا (حضرت حسن رضی اللہ عنہ) سردار ہے، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں میں صلح کرائے گا۔ (بخاری: ۲۷۰۴)

۲. ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو گود میں لے کر روئے اور فرمایا کہ: ''مجھے جبرئیل نے بتایا کہ آپ کی اُمّت انہیں مقامِ ''کربلا'' میں شہید کرے گی۔

قال الهيثمي: رواه الطبراني بأسانيد، ورجال أحدها ثقات. (مجمع الزوائد: ۱۵۱۱۷)

ایک اور حدیث:

نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی، فاطمہ، حسن وحسین رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرمایا: ''میں برسرِ پیکار ہوں اس کے مقابل جس سے تم جنگ کرو اور میں سراپا مصالحت ہوں اس شخص سے جس سے تم صلح کرو۔ (رواه الترمذيُّ و ضعَّفه)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یزید کو ولی عہد نامزد کرنا اور اس کے وجوہات:

سنہ ۵۶ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو نائب اور ولی عہد نامزد کیا۔

ہر دور اندیش حکمران کی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی چاہتے تھے کہ ملک اندرونی اور بیرونی طور پر مضبوط و مستحکم ہو۔ چوں کہ عموماً انتقالِ اقتدار کا مرحلہ خانہ جنگی کا محرّک بنتا تھا، اس لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خطرہ تھا کہ ان کی وفات پر پھر کہیں کوئی بحران نہ پیدا ہوجائے۔ وہ انتقالِ اقتدار کو ایسے جھمیلوں سے دور رکھنا چاہتے تھے جو آراء کے تضاد اور مرکز گریزی کا سبب بنیں۔

آپ رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں اگلے خلیفہ کا اہلِ شام کے نزدیک مقبول ہونا بہت ضروری تھا ورنہ مرکز میں انتشار پیدا ہوتا اور پورا عالمِ اسلام متاثر ہوتا۔ لہٰذا انہوں نے انتقالِ اقتدار کا اختیار اپنے پاس رکھا اور اپنے رفقاء کی مشاورت سے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد مقرر کر دیا۔ اگرچہ اس طرح بات ملوکیت یا موروثی حکومت کی طرف جا رہی تھی مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سمجھتے تھے کہ اگر اصل مقصد یعنی شریعت کی بالادستی قائم رہے تو موروثی حکومت کی گنجائش ہے کیوں کہ اس کی ممانعت پر قرآن وسنت کی کوئی قطعی اور صریح نص موجود نہیں بلکہ: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ قَدۡ بَعَثَ لَكُمۡ طَالُوتَ مَلِكٗا﴾[البقرۃ:۲۴۷] اور ﴿وَوَرِثَ سُلَيۡمَٰنُ دَاوُۥدَ﴾[النمل:۱۶] جیسی قرآنی نصوص سے فی نفسہٖ ملوکیت اور موروثی حکومت کی رخصت ثابت ہوتی ہے۔

علامہ ابنِ خلدون حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کی وجوہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

”جو چیز حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو دوسروں کی جگہ یزید کو ولی عہد بنانے کا محرک بنی، وہ اُمّت کے اتحاد و اتفاق کی مصلحت تھی۔ بنواُمیّہ کے اربابِ حل وعقد اس پر متفق تھے۔ اس وقت وہ اپنے علاوہ کسی پر راضی نہیں تھے۔ وہ قریش کا سب سے مضبوط گروہ تھے اور اہلِ ملّت کی اکثریت انہی سے تعلق رکھتی تھی، اس لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو ترجیح دی اور افضل کی جگہ غیر افضل کو چنا، یہ اتحاد اور اتفاقِ رائے کے لیے ہی کیا جس کی شریعت میں بہت اہمیت ہے۔“ (تاریخ ابن خلدون)

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جیسی افضل شخصیات کی موجودگی میں ایک کم تر فرد کو جانشین بنانا عجیب تھا مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی حکومت کا اکثر دارومدار بنواُمیّہ اور اہلِ شام کی طاقت پر ہے۔ پس اگر خاندان سے باہر کے کسی افضل شخص کو ولی عہد بنا دیا گیا تو یہ لوگ قبائلی

عصبیت کی بناء پر اسے برداشت نہیں کریں گے اور اُمّت خانہ جنگی میں مبتلا ہو جائے گی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ فتوحات کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پھیلتا جا رہا ہے اگر ہم شوریٰ اور ہر علاقے کے لوگوں کی آراء اور صواب دید کو معلوم کرنے میں لگ جائیں تو ممکن ہے کہ آپس میں اختلافات پیدا ہو جائیں اور کہیں فتوحات کا پھیلا ہوا سلسلہ سکڑ نہ جائے۔ پھر یزید ماضی میں غزوۂ قسطنطنیہ میں سالاری کر چکا تھا۔ اس غزوہ میں یزید کے ماتحت جلیل القدر صحابہ شریک تھے، جن میں حضرت ابن عمر، حضرت ابو ایّوب انصاری، حضرت حسین رضی اللہ عنہم وغیرہ شامل تھے۔

مشہور مورخ علّامہ محمد خضری فرماتے ہیں کہ: ''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یزید کو ولی عہد بنانا اصلاحِ اُمّت کے لیے ضروری اور ناگزیر تھا؛ تاکہ اُمّت فتنہ و فساد اور خون خرابہ کا شکار ہونے سے بچ جائے، کیوں کہ حلقۂ انتخاب جس قدر وسیع ہوتا ہے اتنے ہی اُمیدوار بھی زیادہ ہوتے ہیں اور جہاں امیدواروں کی کثرت ہو وہاں اختلاف کا ہونا ایک لازمی امر ہے۔''

جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کے دو پہلو تھے:

ایک ''اپنے بعد کے لیے جانشین مقرر کر دینا تاکہ اُمّت متحد اور متفق رہے۔'' یہ بالکل درست تھا۔

دوسرا پہلو تھا ''اپنے بیٹے کو جانشین بنانا''۔ اس دوسرے پہلو میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے خطائے اجتہادی ہوئی، انتظامی رائے اور سیاسی تدبیر کے درجے میں یہ فیصلہ درست ثابت نہیں ہوا۔ تاہم وہ اپنے اس فعل میں نیک نیّت، مخلص اور اُمّت کے خیر خواہ تھے۔ ان کے پاس ایسے دلائل ضرور تھے جن کی بنا پر انہوں نے یہ قدم اٹھایا اور ان کا یہ فیصلہ بہر حال شرعی جواز کی حدود میں تھا۔

ولا يتهم الإمام في هذا الأمر وإن عهد إلى أبيه أو ابنه؛ لأنه مأمون على النظر لهم في حياته فأولى أن لا يحتمل فيها تبعة بعد مماته. (تاريخ ابنِ خلدون:۲۶۲/۱)

مولانا اسماعیل ریحان لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ یزید کو ولی عہد بنانے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مخلص اور اُمّت کے خیر خواہ تھے اور ان کے نزدیک اس فیصلے کی کچھ وجوہات بھی تھیں؛ تاہم اس بارے میں جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ اس مسئلے میں ان حضرات کی رائے درست تھی جو یزید کو ولی عہد بنانے کے مخالف تھے اگرچہ وقتی حالات کے تحت انعقادِ خلافت اس طرح بھی ہو جاتا ہے، جیسے یزید کے معاملے میں ہوا۔''

قاضی ابوبکر ابن العربی فرماتے ہیں:

''یقیناً افضل یہ تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس قضیے کو شوریٰ کے سپرد کر دیتے اور اپنے کسی رشتہ دار کو بھی اس کے لیے مقرر نہ کرتے چہ جائے کہ بیٹے کو لیکن انہوں نے افضل صورت کو ترک کر دیا۔''

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ تحریر فرماتے ہیں:

''جمہور اُمّت کے محقق علماء ہمیشہ یہ کہتے آئے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ عمل رائے اور تدبیر کے درجے میں نفس الامری کے طور پر درست ثابت نہیں ہوا اور اس کی وجہ سے اُمّت کے مصالح کو نقصان پہنچا ہے۔''

نیز فرماتے ہیں:

''جمہور اُمّت کا کہنا یہ ہے کہ اس معاملے میں رائے انہی حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی صحیح تھی جو یزید کے ولی عہد بنانے کے مخالف تھے۔''

حضرت شیخ الاسلام مدظلہ جمہور کے موقف کے دلائل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے تو بے شک اپنے بیٹے کو نیک نیتی کے ساتھ خلافت کا اہل سمجھ کر ولی عہد بنایا تھا لیکن ان کا عمل ایک ایسی نظیر بن گیا جس سے بعد کے لوگوں نے نہایت ہی ناجائز فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے اس کی آڑ لے کر خلافت کے مطلوبہ نظامِ شوریٰ کو درہم برہم کر ڈالا اور مسلمانوں کی خلافت بھی شاہی خانوادے میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔''

بلا شبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں یزید کا فسق و فجور کسی قابلِ اعتماد روایت سے ثابت نہیں، اس لیے اس کو خلافت کا اہل تو سمجھا جا سکتا تھا لیکن اُمّت میں ایسے حضرات کی کمی نہیں تھی جو نہ صرف دیانت و تقویٰ بلکہ ملکی انتظام اور سیاسی بصیرت کے اعتبار سے بھی یزید کے مقابلے میں بدرجہا بلند مقام رکھتے تھے، اگر خلافت کی ذمہ داری ان کو سونپی جاتی تو بلا شبہ وہ اس سے کہیں بہتر طریقے پر اہل ثابت ہوتے، یہ درست ہے کہ افضل کی موجودگی میں غیر افضل کو خلیفہ بنانا شرعاً جائز ہے، (بشرطیکہ ان میں شرائطِ خلافت موجود ہو) لیکن افضل یہی ہے کہ خلیفہ اس شخص کو بنایا جائے جو تمام اُمّت میں اس منصب کے لائق ہو۔

نیک نیتی کے ساتھ بیٹے کو خلیفہ بنانا جائز تو ہے لیکن موضعِ تہمت ہونے کی وجہ سے بچنا ہی بہتر ہے اور شدید ضرورت کے بغیر ایسا کرنا اپنے آپ کو ایک سخت آزمائش میں ڈالنا ہے۔ اس لیے تمام خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اس سے پرہیز کیا، خاص طور پر عمر فاروق اور علی مرتضی رضی اللہ عنہما نے تو لوگوں کے کہنے کے باوجود اپنے قابل و لائق فرزندوں کو ولی عہد بنانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ (حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق)

بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بیعتِ یزید سے توقف یا اختلاف و تحفّظات کی وجہ:

حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر، حضرت عبد اللہ بن زبیر اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حیات میں یزید کی بیعت نہیں فرمائی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے یزید کی بیعت کر لی، اور حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حیات میں ہی انتقال ہو گیا۔

اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ ان حضرات کے نزدیک بیٹے کو باپ کی جگہ خلیفہ نامزد کرنے میں اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آگے چل کر یہ اصول بن جائے اور ہر خلیفہ کے بعد اس کے بیٹے ہی کو خلیفہ بنایا جانے لگے۔ نیز تقوی وطہارت میں یزید سے افضل لوگ اس وقت موجود تھے۔

یزید کی ولی عہدی کی سب سے زیادہ مخالفت اکابرِ مدینہ کی طرف سے تھی جن کا عالمِ اسلام کی سیاست میں اہم ترین کردار تھا۔ ان حضرات کا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ اس طرح موروثی حکومت اور ملوکیت کی بنیاد پڑ جائے گی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اکابرِ مدینہ کو ہم آہنگ بنانے کی پوری کوشش کی۔ انہوں نے خاص طور پر عراق کے حاکم زیاد کو مدینہ منورہ بھیجا تاکہ وہ اہلِ مدینہ کو قائل کرے۔ زیاد نے تقریر کر کے لوگوں کو ہم نوا بنانے کی کوشش کی مگر حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ (جن کی عمر اس وقت لگ بھگ اسّی برس تھی) کھڑے ہو گئے اور فرمایا:

”اے بنواُمیّہ! تم ہماری تین باتوں میں سے کسی کو اختیار کر لو: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سنّت کو لے لو۔ یہ معاملہ ان سب کو

پیش آیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کے گھرانے میں اس منصب کے اہل موجود تھے مگر انہوں نے معاملہ مسلمانوں کی جماعت کے سپرد کر دیا۔ تم قیصری نظام لانا چاہتے ہو کہ جب ایک قیصر مرے تو دوسرا مسلط ہو جائے۔"

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کچھ مدّت بعد یہی کام مروان کو سونپا۔ مروان نے یزید کی ولی عہدی کے حق میں دلیل دیتے ہوئے کہا: "یہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی سنّتِ راشدہ ہے"۔

عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے پھر اعتراض کیا اور کہا:

"یہ قیصر ہرقل کا طریقہ ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر اور برادری کو بھی چھوڑ کر بنو عدی کے ایک شخص (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کو فقط یہ دیکھ کر منتخب کیا کہ وہ اس کام کا اہل ہے۔"

ان حضرات کے اختلافِ رائے کے پیشِ نظر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خود مل کر انہیں حکمت و تدبیر کے ساتھ یزید کی بیعت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ سنہ ۵۶ ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عمرے کے ارادے سے حجاز تشریف لے گئے۔ ان کی توجہ جن حضرات کی طرف تھی ان میں عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم اہم ترین تھے، مگر یہ تینوں یزید کی بیعت سے بچنے کے لیے مکہ روانہ ہو گئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی ان کے پیچھے مکہ پہنچے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ملاقات کی اور فرمایا: "ابنِ عمر! آپ کہا کرتے تھے کہ آپ کو ایک رات بھی کسی حکمران کے بغیر گزارنا پسند نہیں۔ دیکھئے! اب آپ کہیں کچھ ایسا نہ کر بیٹھیں کہ مسلمانوں میں انتشار اور فتنہ و فساد پیدا ہو جائے"۔

انہوں نے جواب دیا: "بیٹے گزشتہ خلفاء کے بھی تھے، آپ کا بیٹا ان سے بڑھ کر نہیں۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کے لیے وہ نہ سوچا جو آپ اپنے بیٹے کے لیے سوچ چکے ہیں، جہاں تک مسلمانوں میں انتشار اور فساد پھیلانے کی بات ہے تو میں ایسا کرنے والا نہیں۔ جب

لوگ ایک فیصلے پر متفق ہو جائیں گے تو میں بھی ان میں شامل ہو جاؤں گا۔"

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا: "ایک ہی وقت میں دو دو افراد کی بیعت کیسے ہو سکتی ہے؟ آپ خود ہی تو یہ حدیث روایت کرتے ہیں کہ جب دو خلیفوں کی بیعت ہو تو دوسرے کو قتل کر دیا جائے۔"

حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اس فیصلے کے خلاف تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ان سے بھی گفتگو ہوئی مگر کوئی ایک دوسرے کو قائل نہ کر سکا۔ اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان حضرات کو ان کے حال پر چھوڑ کر شام تشریف لے گئے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

"حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت حسین بن علی، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یزید کی بیعت نہیں کی تھی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں چھوڑ دیا تھا۔"

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اختلافِ رائے کی قدر کرتے تھے، تاہم اپنے طور پر وہ سمجھتے تھے کہ یزید کی تقرری میں بہتری ہے۔ آخر میں انہوں نے سرکاری عمائد کو دمشق بلا کر ان سے بات کی۔ مندوبین نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر دیا اور پورے عالمِ اسلام میں نائبین کے ذریعے یزید کی ولی عہد کی بیعت لے لی گئی۔

یزید کی تخت نشینی اور اس کی پہلی سیاسی غلطی:

تخت نشینی کے بعد یزید نے پورے عالمِ اسلام میں امیرِ معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی اطلاع اور اپنی بیعتِ خلافت کے لیے قاصد اور نمائندے روانہ کر دیے۔

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

کی زندگی ہی سے یہ موقف تھا کہ موروثی حکومت سے اجتناب کرتے ہوئے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور کی وسیع البنیاد شورائیت کو اسی شکل میں واپس لانا چاہیے اور اُمّت کی زمامِ اقتدار افضل فرد کے حوالے ہونی چاہیے۔ اسی لیے انہوں نے یزید کے ولی عہدی کی بیعت سے بھی اجتناب کیا تھا۔ ان دونوں کا یزید کی بیعت کرلینا رخصت کے زمرے میں تو آسکتا تھا مگر عزیمت کی بات یہی تھی کہ اس نظام کو تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی جس کے سبب آگے چل کر متعدّد مفاسد پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ اس کے لیے پہلا درجہ یہ تھا کہ یہ حضرات اپنے اختلافِ رائے پر برقرار رہ کر اسلامی سیاست کے صحیح مفہوم کو اجاگر کرتے، بیعت کرکے یزید کے حلقہ بگوشوں میں شامل نہ ہوتے۔

یزید کے لیے مناسب یہ تھا کہ وہ ان حضرات کو اپنی بیعت پر مجبور کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں بہت سے حضرات کو غیر جانب دار رہنے دیا اور ان کے احترام میں کوئی کمی نہ کی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی یزید کی بیعت و ولی عہدی قبول نہ کرنے والے اکابر کو ان کے ضمیر کے خلاف چلنے پر مجبور نہیں کیا۔ یہ یزید کی پہلی سیاسی غلطی تھی کہ اس نے ان بزرگوں پر فوری بیعت کے لیے دباؤ ڈالا اور اپنے والدِ گرامی کی وہ وصیت نظر انداز کردی جس میں اسے شرفاء کے ساتھ سختی نہ برتنے اور اپنی رائے پر اصرار نہ کرنے کی تاکید کی تھی۔ اس وصیت کو فراموش کرکے یزید سے غلط فیصلہ سرزد ہوا جس نے مزید دشوار حالات کو جنم دیا جن سے نمٹنے میں یزید نے مزید غلط فیصلے کیے اور یوں حالات قابو سے باہر ہوتے چلے گئے۔

بیعت پر جبر کیے جانے سے بچنے کے لیے حضرت عبد اللہ بن زبیر اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما مدینہ سے مکہ جانے پر مجبور ہوگئے، وجہ یہ تھی کہ مدینہ شام (دار الحکومت) سے

نسبتاً قریب تھا۔ مکّہ اس سے دوگنا مسافت پر اور پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس لیے یہاں حکام کا ان پر گرفت کرنا مشکل تھا۔ پھر حرم کی تقدیس کے پیشِ نظر حکومت سے توقع کی جاتی تھی کہ وہاں کوئی کاروائی کرکے بدنامی مول نہیں لے گی۔

تاہنوز حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کوفہ جانے کا پختہ ارادہ نہیں کیا تھا کیوں کہ جب حضرت عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ نے آپ سے دریافت فرمایا کہ: کہاں کا ارادہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ابھی مکہ جارہا ہوں، وہاں آئندہ کے لیے مشورہ کروں گا۔ البتہ سفرِ کوفہ کا خیال اِمکانی طور پر ذہن میں رکھا تھا، (اگر حکومت کی طرف سے بیعت پر جبر کا اندیشہ نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ آپ سفرِ کوفہ نہ فرماتے)۔

لیکن یزید نے کوفہ میں صحابیِ رسول حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو معزول کرکے عبیداللہ بن زیاد ایک سخت مزاج شخص کو کوفہ کا گورنر اور ولید بن عتبہ جو نرم دل تھا کو معزول کرکے عمرو بن سعید الاشدق جو سختی میں مشہور اور منہ پھٹ تھا کو حاکمِ حجاز مقرر کردیا۔ عمرو نے آتے ہی مسجدِ نبوی کے منبر پر قسم کھاکر مکہ معظمہ پر چڑھائی کا عزم ظاہر کیا جہاں یہ حضرات پناہ لیے ہوئے تھے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ - جو ایک دور اندیش عقل مند شخص تھے - کو اندیشہ تھا کہ حکومت بیعت لینے پر کسی بھی حد تک پہنچ سکتی ہے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ نہیں چاہتے تھے کہ مکہ معظمہ کی حرمت ان کی تحریک میں پامال ہو اور حکومت حرمِ مکہ میں خون ریزی کرے۔

یزید کا دھمکی آمیز خط بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو پہنچ چکا تھا کہ: حسین (رضی اللہ عنہ) کے پاس مشرق کے لوگ آکر انھیں خلافت کی امید دلا رہے ہیں۔ آپ حالات سے باخبر تجربہ کار انسان ہیں اگر حسین نے ایسا کیا تو قرابت داری کے بندھن ٹوٹ جائیں گے۔ آپ خاندان کے

بڑے اور معزز آدمی ہیں، ان کو اس شورش پسندی سے روکیں۔

خاندانِ نبوت میں ایک حدیث مشہور تھی یقیناً یہ آپ سے پوشیدہ نہیں ہوگی۔ جس میں ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو گود میں لے کر روئے اور فرمایا: مجھے جبرئیل نے بتایا کہ آپ کی اُمّت انہیں مقام کربلاء میں شہید کرے گی۔ (مجمع الزوائد) اور آپ اہلِ عراق (کوفہ) کی تلوّن مزاجی سے واقف تھے کہ وہ کبھی بھی ساتھ چھوڑ سکتے ہیں۔ ان سب باتوں کے پیشِ نظر حضرت حسین رضی اللہ عنہ بہت سوچ سمجھ کو فیصلہ کرنے والے تھے۔

مکہ مکرمہ میں حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما غور کرتے اور موقع بموقع مشورہ کرتے، وہ دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی مناسب مقام کو مرکز بنا کر اپنی جدوجہد کو آگے بڑھانا چاہیے مگر جدوجہد کے مرکز کے تعین میں دونوں کی رائے الگ الگ تھی۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مکہ کو سب سے محفوظ اور مناسب سمجھتے تھے جو عالمِ اسلام کا ایمانی و روحانی مرکز تھا اور وہاں ان کے حامی قریشیوں کے علاوہ اہلِ صلاح و تقویٰ کی بڑی تعداد آباد تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی مکہ ہی کو مرکز بنائیں۔ لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر اور اس وجہ سے کہ کوفہ سے خطوط آرہے تھے اور وہاں افرادی قوت زیادہ تھی کوفہ کو مرکز بنانے کا ارادہ کیا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو یہ بھی فرمایا تھا کہ: ”اگر میں کہیں اور قتل کر دیا جاؤں تو یہ مجھے پسند ہے مگر یہ گوارا نہیں ہے کہ میری وجہ سے اس سرزمین کی عظمت پامال ہو“۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سفرِ کوفہ (تحریک) کا اصل مقصد اور اس کا پس منظر:

اس بارے میں چند اسباب ذکر کیے گئے ہیں:

(۱) آپ یزیدی فوج سے لڑنے اور جہاد کرنے کے لیے گئے تھے۔

(۲) طلب خلافت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔

(۳) آپ کا مقصد ان ناراض باغی کوفیوں کو سمجھانا تھا جو خلافت اسلامیہ کی اینٹ سے اینٹ بجانا چاہتے تھے۔ اس طرح کہ اگر تم مجھے مقتدی اور امام سمجھتے ہو تو پھر چلو یزید کی خلافت کو مضبوط کر لو اور فتنہ وفساد چھوڑ دو۔

(۴) چوتھی رائے اور یہی برحق و صواب ہے ء جیسا کہ مولانا اسماعیل ریحان لکھتے ہیں: حضرت حسین وہ ہستی ہیں جنہوں نے آغوش رسول میں پرورش پاکر اعلیٰ ایمانی واخلاقی اقدار کی گھٹی لی اور حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کی نہ صرف بیش از بیش شفقتیں سمیٹیں بلکہ ان سے اکتساب فیض بھی کرتے رہے۔ وہ پوری اُمّت میں سب سے عالی نسب اور حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کے علم و عرفان، اور ان کی سیاست و فقاہت کے امین تھے۔ دینی بصیرت علمی رسوخ اور دور اندیشی کے لحاظ سے وہ اُمت کے ممتاز ترین فرد تھے۔ پھر وہ کوئی ناتجربہ کار جوشیلے نوجوان نہیں بلکہ زمانے کے سرد وگرم چشیدہ تھے اور اس وقت وہ اپنی عمر کی چھٹی دھائی پوری کرنے والے تھے۔ ایسی ہستی کے بارے میں یہ گمان کر لینا بہت سطحی بات ہوگی کہ وہ محض یزید کی ذاتی کمزوریوں یا اس کے متعلق فسق وفجور کی شہرت کو بنیاد بنا کر بیعت سے اجتناب کر رہے ہوں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کی نگاہ اسلامی نظام سیاست میں پڑنے والے اس رخنے پر تھی جو بظاہر معمولی اور فی الحال قابلِ تحمل لگتا تھا مگر وہ ایک غیر معمولی دور اندیش مدبر کی طرح مستقبل کو

گویا کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، جہاں اس معمولی انحراف کے اثرات، چند نسلوں بعد نہایت منفی انداز میں برآمد ہونے کو تھے۔

جس طرح دریا کے بند میں پڑنے والی دراڑ سے پانی رِستا دیکھ کر ایک تجربہ کار آدمی یقینی طور پر خطرہ محسوس کر لیتا ہے اور ساری مصروفیات چھوڑ کر اپنی پوری جان اس معمولی سے شگاف کو پُر کرنے میں لگا دیتا ہے اور ان لوگوں کے اعتراضات کی بالکل پروانہیں کرتا جو خطرے کا پوری طرح اندازہ نہ لگا پانے کے باعث، اس کی تگاپو کو کارِ عبث سمجھ رہے ہوں، بالکل اسی طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کل کے مضرات کو آج ہی پوری طرح بھانپتے ہوئے، جان کی پروا کیے بغیر، ایک موقف اختیار کر لیا اور پھر اس بارے میں کسی کی نصیحت و فہمائش کو خاطر میں نہ لائے۔

آپ رضی اللہ عنہ کے سامنے وہ فرامینِ نبویہ بھی تھے جن میں برائی کو حسبِ قدرت ہاتھ یا زبان سے روکنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگرچہ اس راستے میں سخت خطرات بھی تھے اور ان حضرات کو پورا اندازہ تھا کہ یہ جان کی بازی ہے مگر ان کی فقاہت فیصلہ دے رہی تھی کہ جان پر کھیل کر عزیمت کی راہ اختیار کرنا کم از کم ان کے حق میں واجب ہو چکا ہے کیوں کہ موروثی شخصی نظامِ حکومت آگے چل کر جن مفاسد کا باعث بنے گا، ان کا سدِّباب شاید بعد میں ممکن نہ ہو سکے، پس سیاسی نظام کے بگاڑ کو درست کرنے کی کوشش ابھی سے ضروری ہے۔

چوں کہ عالمِ اسلام میں کہیں اور سے کوئی آواز نہیں اٹھ رہی تھی اس لیے ان کی فقاہت نے فیصلہ دیا کہ جان پر کھیل کر عزیمت کی یہ راہ اختیار کرنا کم از کم ان پر واجب ہو چکا ہے بشرطے کہ فتنہ و فساد کی نوبت نہ آئے۔ ان کا خیال تھا کہ رائے عامّہ کو ہموار کر کے حکومت پر دباؤ ڈالا جا سکتا ہے۔

یزید اور اس کے گورنروں کی دھمکیوں سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ یزید یا اس کے حُکّام ان کے موقف پر غور کیے بغیر بغاوت کا مرتکب سمجھ کر قتل بھی کرا سکتے ہیں۔ اس لیے اس وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید سے مل کر اپنا موقف پیش کرنے کوشش نہیں کی بلکہ عراق جاکر اپنے حامیوں کی مدد سے تبدیلی لانے کی کوشش کو سود مند سمجھا۔

اور اہلِ کوفہ کے لگاتار خطوط ووُفود حالات کا یہ منظر نامہ بتا رہے تھے کہ اگر فوری طور پر عراق کا سفر نہ کیا گیا تو وہاں زبردست قتل وغارت شروع ہو سکتی ہے کیوں کہ وہاں کے کم حوصلہ اور عجلت پسند لوگ کسی بھی وقت اندھا دھند بغاوت برپا کر سکتے تھے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے والد ماجد کے طرزِ عمل کا برسوں مشاہدہ کیا تھا کہ انہوں نے نادان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑنے کی بجائے شفقت ومحبت سے اپنے ساتھ ملا کر ان کی تربیت کی کوشش کی تھی۔ اس وقت ایسے ہزاروں عقیدت مند مضطرب وبے قرار ہو کر آپ کو بلا رہے تھے اور آپ کے سوا ایسا کوئی نہ تھا جو ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر ان کی رہنمائی کرتا۔ اگر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو ایک بے مقصد خانہ جنگی شروع ہو جانا بعید نہ تھا۔ جب کہ ایک قائد کی موجودگی میں عوام کی تنظیم کر کے ان کے دباؤ کے ذریعے پُرامن طور پر یا کم نقصان کے بدلے مقاصد حاصل کیے جا سکتے تھے۔ اس لیے آپ نے خطرہ مول لے کر عراق جانا ضروری سمجھا۔ آپ امید کرتے تھے کہ وہاں آپ کو لوگوں کی رضا ورغبت کے ساتھ اُمت کی قیادت کا موقع مل جائے گا، ادھر اہلِ حجاز بھی عبداللہ بن زبیر کی سرکردگی میں حمایت کریں گے۔ اتنی مضبوط عوامی تائید مل جانے کے بعد اہلِ شام پر جو دباؤ پڑے گا، اس کے باعث یا تو وہ مفاہمت کر کے نظام کی اصلاح پر تیار ہو جائیں گے اور بلا جنگ وجدل ایک مثالی حکومت قائم کی جا سکے گی۔ اور اگر اہلِ شام نہ مانے تو عراق اور حجاز کی مشترکہ طاقت کسی بڑے جانی و

مالی اِتلاف کے بغیر انہیں مغلوب کرلے گی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مہم کا ہدف شروع سے مثبت تھا جس میں عوامی حمایت کے ذریعے اصلاح احوال کے لیے مذاکرات ومفاہمت سمیت ہر جائز صورت کے امکانات سامنے رکھے گئے تھے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی یہ مہم خروج نہ تھی:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی یہ فکر وسعی خروج یا بغاوت نہ تھی، در حقیقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تحریک اپنے اُس آخری مرحلے تک پہنچ کر بھی جس میں جانثاری اور جانبازی کا رنگ نمایاں ہو چکا تھا، اس قدر محتاط اور حدِ اعتدال کے اندر تھی کہ اس پر خروج کا اطلاق کر دینا آسان نہیں۔

اس معاملے پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے تجزیے اور اجتہاد کے مطابق ابھی یزید کی خلافت منعقد نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں یزید کے لیے ولی عہدی کی جو بیعت لی گئی تھی، اس کی حیثیت محض ایک مشورے کی تھی اور اس سے یزید کی خلافت ثابت نہیں ہوگی۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی فرماتے ہیں: ”علماء کا راجح قول یہ ہے کہ ولی عہد بنانے کی حیثیت ایک تجویز کی سی ہوتی ہے اور خلیفہ کے بعد اُمّت کے اربابِ حل وعقد کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ چاہیں تو ولی عہد ہی کو خلیفہ بنائیں اور چاہیں تو باہمی مشورے سے کسی اور کو خلیفہ مقرر کر دیں۔ لہٰذا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد یزید کی خلافت اس وقت تک منعقد نہیں ہو سکتی تھی جب تک اُمّت کے اربابِ حل وعقد اسے منظور نہ کرلیں۔

(حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق: ۱۳۶)

اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ یزید مسندِ خلافت پر بَراجمان تو ہو چکا تھا مگر شام کے سوا کہیں بھی اسے مسلمانوں کی حمایت میسر نہ تھی۔ دمشق کے علاوہ عالمِ اسلام کی سیاست کے بڑے مراکز: مکہ، مدینہ، کوفہ اور بصرہ تھے، حجاز کے لوگ یزید سے ناراض تھے اور عراق کے خطوط یہ بتا رہے تھے کہ وہاں بھی یزید کا کنٹرول نہیں ہے۔

ان حالات میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یہ خیال زمینی حقائق کے خلاف نہ تھا کہ یزید کی حیثیت ایک ایسے سیاست دان کی سی ہے جو اُمّت کی رضا و رغبت کے بغیر جبراً مسلط ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کی خلافت ابھی منعقد نہیں ہوئی، لہٰذا اس کا غلبہ ثابت ہونے سے پہلے پہلے ایک مثالی حکومت کے قیام کی سعی کر گزرنا، اُس خروج میں داخل نہیں ہو گا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ یہ بنی ہوئی حکومت کو توڑنا نہیں بلکہ ایک متنازعہ حکومت کے قیام کی کوشش کو روک کر مسلمانوں کو خلفائے راشدین کے طریقے کے مطابق ایک متفقہ اور مقبول حکومت فراہم کرنے کی سعی ہو گی۔

اس راستے میں سخت خطرات تھے اور ان کو بھی پورا اندازہ تھا کہ یہ جان کی بازی ہے مگر ان کی فقاہت فیصلہ دے رہی تھی کہ جان پر کھیل کر عزیمت کی یہ راہ اختیار کرنا کم از کم ان کے حق میں واجب ہو چکا ہے۔ بالفرض یزید کی حکومت پہلے دن سے مستحکم مان لی جائے تو خروج فقہی تعریف کے مطابق اس وقت ثابت ہوتا ہے جب دو شرطیں پائی جائیں:

(۱) حکمران کی اطاعت نہ کرنا۔

(۲) کسی علاقے پر عسکری کنٹرول ہونا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی جدوجہد اور تحریک میں کسی ایک جگہ پر بھی عسکری کنٹرول ثابت نہیں۔

اکابر کی اکثریت بیعت پر آمادہ کیوں ہوئی؟

مولانا اسماعیل ریحان لکھتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کچھ تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دلائل اور اجتہاد سے متفق تھے اور کچھ نے شریعت کے ایک دوسرے حکم کی پیروی میں بیعت کرلی تھی۔ وہ حکم ہے اتحاد واتفاق کو برقرار رکھنا اور افتراق سے گریز کرنا۔ یہ حکم قرآن وحدیث کی متعدّد نصوص میں موجود ہے۔ اس اہم حکم کو پورا کرنے کے لیے بعض حالات میں معمول سے ہٹ کر کسی کم تر غیر افضل صورت کو ناگواری کے باوجود اختیار کرلیا جاتا ہے۔ بیعت کرنے والے اکابر کا یہی خیال تھا۔ حمید بن عبدالرحمن کی روایت ہے کہ یزید کے خلیفہ بننے کے وقت وہ ایک صحابی کے پاس گئے تو انہوں نے فرمایا: ”تم کہتے ہو کہ یزید اُمّتِ محمدیہ کا بہترین فرد نہیں، علم وفقاہت اور مرتبے میں سب سے اعلیٰ نہیں، میں بھی یہی کہتا ہوں مگر اللہ کی قسم میں اُمّتِ محمدیہ کے متحد رہنے کو اس کے منتشر ہونے پر ترجیح دیتا ہوں۔“

اکابر کی بیعت پر آمادگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت یزید کی شہرت ویسی نہیں تھی جیسے بعد میں سانحۂ کربلا، واقعۂ حرّہ اور حصارِ کعبہ جیسے اَن مِٹ داغ اس کے دامن پر لگ جانے کے بعد ہوئی، بلکہ تخت نشینی کے وقت تو وہ اپنے بعض عیوب کے باوجود ایک صحابی کا بیٹا، ایک نیک وصالح خاندان کا فرد اور ایک اعلیٰ نسب شہزادہ سمجھا جاتا تھا، اس لیے بہت سے اکابر خدشات کو نظر انداز کرکے نیک اُمیدیں وابستہ کرنے کی گنجائش سمجھ رہے تھے۔

کوفہ کے سفر کا عزم:

”اگر میں ادھر ادھر قتل بھی کردیا جاؤں تو یہ مجھے پسند ہے، مگر یہ گوارا نہیں کہ میری وجہ سے اس سرزمین کی عظمت پامال ہو۔“ (حضرت حسین رضی اللہ عنہ)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ مکہ پر یزید کے نائبین کی طرف سے حملہ ضرور ہوگا، جیسا کہ عمرو بن سعید الاشدق کے پہلے خطبے سے صاف عیاں تھا، ایسی صورتِ حال میں اہلِ مکہ بھی دفاع پر مجبور ہوتے اور نتیجہ مسلمانوں کی باہمی جھڑپ کی شکل میں نکلتا مقدّس سرزمین خونِ مسلم سے داغ دار ہوتی، لہٰذا حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے مکہ میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔

جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرات طلحہ وزبیر اور سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم عوامی حمایت کے ذریعے بلوائیوں پر قابو پانے بصرہ گئے تھے، اس طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی عوامی دباؤ کے ذریعے حکومت کی ساخت میں تبدیلی کرانا چاہتے تھے تاکہ خلافتِ راشدہ کا شورائی نظام دوبارہ بحال ہو جائے۔ اگر آپ یزید سے بیعت کر لیتے تو اس اصلاحی کوشش اور فکر وتدبیر کا حق ختم ہو جاتا جب کہ آپ اس حق کو باقی رکھنا چاہتے تھے اور اس میں اُمّت کی مصلحت تصور کرتے تھے۔

آپ کو کوفہ بلانے والے:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ جن لوگوں کی دعوت پر کوفہ جانا چاہتے تھے، ان میں ایک صحابی حضرت سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ اور بعض تابعین بھی تھے جب کہ بعض لوگ قبائل کے رؤساء تھے۔ ان کے علاوہ کچھ شر پسند، مفاد پرست اور سازشی لوگ بھی تھے جن کا لائحۂ عمل غالباً یہ تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کسی طرح کوفہ کا رُخ کر لیں اور حکومت کسی تدبّر کا ثبوت دیے بغیر سخت کارروائی کر بیٹھے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید کر دیے جائیں۔ بہر کیف خطوط بھیجنے والے نیک سیرت اہلِ کوفہ کو بلا ثبوت اس سازش میں شریک نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب خطوط اور وُفود کا تانتا بندھ جانے سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو محسوس ہوا کہ کوفہ جا کر آپ کے نیک عزائم پورے ہو سکتے ہیں تو آپ وہاں جانے کا سوچنے لگے مگر اس کا حتمی فیصلہ نہیں کیا۔ آپ

نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے پہلے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل رحمۃ اللہ علیہ کو کوفہ روانہ کر دیا۔

مسلم بن عقیل رحمۃ اللہ علیہ کوفہ میں:

مسلم بن عقیل کوفہ پہنچ کر شہر کے ایک مخلص مسلمان ہانی بن عروہ کے مہمان ہوئے، اس وقت کوفہ کے گورنر صحابیِ رسول حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ تھے، وہ جانتے تھے کہ یہ ایک اصلاحی تحریک ہے اور حق اظہار مافی الضمیر ہے، اس لیے انہوں نے مسلم بن عقیل سے لوگوں کے ملنے ملانے پر کوئی قدغن نہ لگائی، مسلم بن عقیل نے ان حالات میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اطلاع بھیج دی کہ بارہ ہزار افراد بیعت ہو چکے ہیں آپ تشریف لے آئیں!

مسلم بن عقیل کا مراسلہ بھیجنے کے بعد کوفہ کے بدلتے حالات:

مسلم بن عقیل کا مراسلہ مکہ پہنچنے تک کوفہ کے حالات بدل گئے جن سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ بے خبر رہے۔ ہوا یہ کہ کوفہ کے بعض شر پسند امراء نے مسلم بن عقیل کے متعلق حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی نرم خوئی کو ناپسند کیا اور یزید کو سارا حال نمک مرچ لگا کر لکھ بھیجا۔ اس نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے عبید اللہ بن زیاد کو بصرہ کے ساتھ کوفہ کی حکومت بھی دے دی۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ: "مسلم بن عقیل کو تلاش کرو مل جائیں تو قتل کر ڈالو"۔

یزید کے اس حکم کے باعث عراق کے سارے معاملات ایسے بدترین شخص کے اختیار میں آ گئے جس کی اُفتادِ طبع کسی بھی سنگین ترین سانحے کو جنم دے سکتی تھی۔ عبید اللہ بن زیاد، یزید کا حکم ملتے ہی بصرہ سے سیدھا کوفہ پہنچ گیا۔ مسلم بن عقیل اس وقت شہر کے ایک ممتاز امیر ہانی بن عروہ کے ہاں قیام پذیر تھے۔ عبید اللہ بن زیاد کو خبر مل گئی۔ اس نے ہانی کو بلا کر پوچھ گچھ کی۔ جب انہوں نے مسلم بن عقیل کا پتہ نہ بتایا تو سخت زدوکوب کے بعد قلعے میں بند کر

دیا۔ اس کے بعد عبید اللہ بن زیاد نے مسلم بن عقیل کے خلاف کارروائی کرائی اور انہیں قتل کرکے لاش محل کی چھت سے نیچے پھینکوادی۔ ہانی بن عروہ کو بھی قتل کر دیا گیا۔ ادھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ مسلم بن عقیل کا تسلی بخش خط پڑھ کر مع اہل وعیال کوفہ جانے کی تیاری کر چکے تھے۔

یزید کا خط ابنِ زیاد کو:

یزید کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کوفہ روانگی کی خبر مل چکی تھی۔ اس نے ابن زیاد کو درجِ ذیل پیغام بھیجا:

مجھے خبر ملی ہے کہ حسین کوفہ کی طرف آرہے ہیں۔ حسین کے معاملے میں سارے زمانوں میں تمہارے زمانے کو، سارے شہروں میں سے تمہارے شہر کو اور سارے حکام میں سے تم کو امتحان آپڑا ہے۔ ایسے ہی امتحانات میں پڑکر لوگ ترقی پاتے ہیں یا غلاموں کی طرح پست درجہ ہوجاتے ہیں۔

چنانچہ ابن زیاد نے پوری کوشش کی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ کی صورتِ حال سے بالکل بے خبر رکھا جائے۔ اس نے تمام شاہراہوں پر اتنی سخت ناکہ بندی کرائی کہ کوئی شخص یہ علاقے عبور کرکے حضرت حسین رضی اللہ عنہ تک نہ پہنچ سکے۔ مسلم بن عقیل ۸/ ذوالحجہ کو قتل کیے گئے تھے اور اس سے ایک دن پہلے حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ سے نکلے تھے۔

انہیں معلوم نہ تھا کہ کوفہ میں اب حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نہیں سخت گیر عبید اللہ بن زیاد مسلط ہے۔

کوفہ کی حقیقی صورتِ حال کا علم اور واپسی کا ارادہ:

آخر کار عراق کی سرحد کے قریب آپ کو خبر ملی کہ کوفہ کے نئے حاکم ابنِ زیاد نے مسلم بن

عقیل کو قتل کرادیا ہے۔ آپ سمجھ گئے کہ اب اصل مقصد یعنی سیاسی نظام کی اصلاح جو عوام کی حمایت پر موقوف تھا، حاصل نہ ہوگا اور عبید اللہ بن زیاد بلاوجہ آپ کو باغی سمجھ کر مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ جیسے سلوک کا نشانہ بنائے گا۔ اس لیے آپ کو یہی بہتر لگا کہ واپس حجاز چلے جائیں۔

مگر جب آپ نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو مسلم بن عقیل کے بھائیوں نے، جو آپ کے ہمراہ تھے، جوش میں آکر کہا: اللہ کی قسم! ہم جب تک مسلم کے خون کا بدلہ نہ لیں گے، واپس نہیں جائیں گے چاہے خود سب قتل ہوجائیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہارے بغیر جینے کا کیا لطف۔

حُر بن یزید سے ملاقات:

آپ کچھ آگے کوفہ کی انتظامی سرحد تک پہنچ گئے جہاں عبید اللہ بن زیاد کے حکم سے پہرے لگائے گئے تھے۔ یہیں ابنِ زیاد کے سالار حُر بن یزید سے ملاقات ہوئی جو ایک شریف آدمی تھا۔ اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی خیر خواہی کی۔ پوچھا: "کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ جب آپ نے کوفہ کا ارادہ بتایا تو حُر نے سختی سے منع کیا اور کہا: واپس چلے جائیے وہاں آپ کے لیے خیر کی کوئی اُمید نہیں۔

نئی صورتِ حال کی وجہ یزید سے ملاقات کا عزم اور اس کے اسباب:

ان حالات میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تاکہ اُسے گفت وشنید کے ذریعے اسلامی شورائیت کی طرف لانے کی کوشش کرلی جائے۔ اگر ایسا ہوجاتا تو یزید کے لامحدود اختیارات میں کمی آجاتی اور بہت سے مفاسد کا راستہ بند ہوجاتا۔ یہ فیصلہ اتنا اٹل

تھا کہ آپ بہر صورت اس پر عمل پیرا ہو گئے اور شام کا راستہ اختیار کر لیا۔ لائحۂ عمل میں تبدیلی کی وجہ ہمارے بعض اکابر کے مطابق یہ تھی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جان لیا تھا کہ اب یزید کی حکومت قائم و مستحکم ہو چکی ہے اور مسئلے کی نوعیت بدل چکی ہے، چوں کہ آپ جانتے تھے کہ ایک قائم شدہ حکومت کو ختم کرنے کی کوشش خروج کے زمرے میں آتی ہے، لہٰذا آپ نے شرعی حدود کے مطابق متبادل راستے کو ترجیح دی کہ شاید رُوبرو مذاکرات سے مقصد حاصل ہو جائے۔

آپ رضی اللہ عنہ کی جدوجہد اور سعیِ مشکور اعلیٰ مقاصد کے لیے شروع کی گئی ایک سیاسی و اصلاحی تحریک تھی، آپ کے کوفہ جانے کا مقصد حصولِ اقتدار نہیں بلکہ نظام کی اصلاح تھا، کوفہ میں عقیدت مندوں کو جمع کر کے آپ یہی کرنا چاہتے تھے مگر اب نئی صورتِ حال میں آپ کے نزدیک آخری صورت یزید سے براہِ راست بات کرنا رہ گئی تھی، چنانچہ آپ دمشق کے راستے پر روانہ ہو گئے۔

مقتلِ کربلا اور یزید کا ابنِ زیاد کے نام مراسلہ:

یزید نے ابنِ زیاد کو مسلم بن عقیل کے قتل پر شاباشی دیتے ہوئے یہ احکام بھی دیے تھے:

"جاسوس اور مسلح پہرے دار تعینات کر دو۔ جن لوگوں پر شک ہو انہیں گرفتار کر لو۔ جس پر کوئی الزام ہو اسے پکڑ لو مگر قتل اس کو کرنا جو تم سے جنگ کرے۔ مجھے پیش آمدہ حالات کی اطلاع دیتے رہنا۔"

اِس مراسلے سے ثابت ہوتا ہے کہ یزید کی طرف سے ابنِ زیاد کو قافلہ حسینی پر ابتداءً دست درازی کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی بلکہ اس کاروائی کو ناگزیر حالات کے ساتھ مشروط کیا گیا تھا۔ ممکن ہے یزید نے اپنے خیال میں اس تدبیر کو کافی سمجھا ہو مگر حالات نے

ثابت کیا کہ یہ ہدایات بالکل ناکافی تھیں۔ اِسی مراسلے میں مسلم بن عقیل کے قتل پر ابنِ زیاد کی جو حوصلہ افزائی کی گئی تھی، وہ اس سخت مزاج شخص کو اس خبط میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھی کہ حریف کا قلع قمع کرنے کی ذرا بھی گنجائش ملے تو اسے غنیمت سمجھنا چاہیے اور یہ کہ قافلۂ حسینی سے رعایت نہیں برتنی چاہیے۔

اگر یزید اس جگہ عبیداللہ بن زیاد کو یہ ہدایت دیتا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو احترام کے ساتھ دمشق بھیج دیا جائے تو سازشی عناصر کی اُمیدیں بَر نہ آتیں۔ بلاشبہ یزید کی یہ سنگین ترین غلطی تھی جس نے معاملے کو انتہائی حد تک بگڑنے دیا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ دمشق کے راستہ میں اور ابنِ زیاد کا مقصد:

آپ رضی اللہ عنہ دمشق کے راستے پر تقریباً ۴۵ر میل سفر کر کے آخر کربلا تک پہنچے جو کوفہ سے دمشق جانے والی شاہراہ پر واقع ہے، یہاں دریائے فرات کا کنارہ قریب تھا جسے ''الطف'' کہا جاتا تھا، اگرچہ یہ بات ظاہر تھی کہ دمشق اور کوفہ میں حکومتی پالیسی یکساں ہوگی اور حکومتی حلقے میں ہر جگہ آپ رضی اللہ عنہ کو باغی گمان کیا جارہا ہوگا مگر ابنِ زیاد (جیسے سخت مزاج شخص) کے مقابلے آپ کو یزید سے یہ توقع تھی کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے کم از کم آپ کے موقف کو ضرور سنے گا۔

اب عبیداللہ بن زیاد چاہتا تو قافلۂ حسینی کو شام کی طرف جانے دیتا مگر اس نے ضد اور غرور کی بناء پر قافلے کو ''کربلا'' میں رُکوا کر اصرار کیا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ یہیں گرفتاری دے کر اس کے پاس کوفہ حاضر ہوں۔ اس نے جس طرح مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کو مجبور اور لاچار بنا کر قتل کیا تھا اس قسم کا سلوک وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی کرنے کی ٹھانے ہوئے تھا تاکہ لوگ حکومت سے خائف رہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے شروع سے سرحدی سپاہ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ قافلۂ حسینی کو حراست میں لے کر سیدھا کوفہ لے آئے مگر اب حضرت

حسین رضی اللہ عنہ دمشق کا رُخ کر چکے تھے اور کوفہ کی فوج کا افسر حُر بن یزید طبعی نرمی اور شرافت کی وجہ سے اب تک آپ کو گرفتار کرنے سے گریزاں تھا۔

عمر بن سعد کی آمد:

اِس صورتِ حال سے ابنِ زیاد سٹپٹا گیا۔ اس نے عمر بن سعد کو ''رَے'' (تھران) کی صوبہ داری کے وعدے کے ساتھ یہ مہم سونپ دی کہ وہ جاکر حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے نمٹ لے، یعنی انہیں کسی اَمان کے وعدے کے بغیر غیر مشروط طور پر گرفتار کر کے کوفہ لے آئے اور اگر وہ خود کو حوالے نہ کریں تو انہیں قتل کر دے۔ عمر بن سعد نے رات بھر کی مہلت مانگی اور رات بھر سوچتا رہا۔ صبح آکر اس نے آمادگی ظاہر کی اور لشکر لے کر نکل پڑا جو چار ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا۔

آخر اس کے ہراَوَل دستوں نے اس وقت قافلۂ اہلِ بیت کو جالیا جب وہ میدانِ کربلا کے قریب سے گزر رہا تھا۔ یہیں قافلے کو گھیر لیا گیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے قافلے کو گھِرتا دیکھ کر اس جگہ کا نام پوچھا تو بتایا گیا ''کربلاء''۔

آپ کی زبان سے بے ساختہ نکلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا: یہ ارض کرب و بلاء ہے۔ یعنی آپ کو فرمانِ نبوی کی بناء پر اِسی جگہ اپنی شہادت کا یقین ہو گیا تھا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا افسرانِ فوج کے سامنے تین صورتیں رکھنا:

یہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اَفسرانِ فوج: عمر بن سعد، شِمر بن ذی الجوشن اور حصین بن نُمیر سے بات چیت ہوئی۔ آپ اپنی شہادت کا مقام آنکھوں کے سامنے دیکھنے کے باوجود اُمّت کے خیر خواہ تھے اور ان لوگوں کو بدبختی کی انتہاء سے بچانا چاہتے تھے، لہٰذا آپ نے ان کے سامنے تین صورتیں رکھیں:

(۱) جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس جانے دیا جائے۔

(۲) یزید سے ملاقات کا موقع دیا جائے۔

(۳) کسی سرحد کی طرف نکل جانے دیا جائے۔

عمر بن سعد مان گیا۔ اس نے ابنِ زیاد کو اطلاع دی مگر اس نے ابتداءً ماننے کے بعد شِمر کے کہنے پر انکار کر دیا اور حکم دیا کہ حسین سے غیر مشروط طور پر بیعت لو۔ یہ بات آپ کے مشن اور غیرت کے خلاف تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: واللہ! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

بات چیت ختم ہو جانے کے بعد بھی عمر بن سعد جنگ کو ٹالنا چاہتا تھا مگر عبید اللہ بن زیاد کوفہ میں بیٹھ کر پَل پَل کی خبریں لے رہا تھا۔ اس نے جویریہ بن بدر تمیمی کو یہ حکم دے کر بھیج دیا کہ عمر بن سعد کو کہو فوراً حسین اور ان کے ساتھیوں سے لڑائی شروع کرے ورنہ اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔ عمر بن سعد نے یہ دھمکی سنی تو جلدی جلدی ہتھیار پہنے اور جنگ شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔ عمر بن سعد کی فوج کے ایک شخص عمرو بن خالد طہوی نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر تیر چلایا۔ یہ گویا جنگ کا پیش خیمہ تھا۔ تیر آپ کے دونوں شانوں کے درمیان جبے (کرتے) میں پیوست ہو گیا۔

حُر بن یزید کی تقریر:

اِس دوران کوفہ کی گھڑ سوار فوج کے سالار حُر بن یزید کا ضمیر جاگ اٹھا۔ فوج کو جنگ پر تیار دیکھ کر اس نے دیگر سرداران کو ملامت کرتے ہوئے کہا: ”کیا تم حسین کی درخواست قبول نہیں کرو گے؟ اللہ کی قسم! اگر ایسی درخواست ترکستان اور دَیلم کے کفار بھی تم سے کرتے تو اسے مسترد کرنا جائز نہ ہوتا۔“ مگر ان اَفسران پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تب حُر نے اپنے گھوڑے کا رُخ پھیرا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل ہو گیا۔

اس وقت آپ کے ساتھ ۱۰۰/ کے قریب اَفراد تھے۔ ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پانچ بیٹے اور بنوہاشم کے سولہ افراد تھے۔

خون ریز جنگ کا آغاز:

عمر بن سعد کے سپاہی تلواریں سونتے تیار تھے۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ آگے بڑھو! حسین اور ان کے ساتھیوں سے جنگ کرو۔

''امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے قافلۂ بنوہاشم کی خیمہ گاہ پر نیزہ لے کر حملہ نے والا یہی عمر بن سعد تھا۔ اس کے بعد عام لڑائی شروع ہوگئی۔''

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت:

آخر کار اس خونریز لڑائی میں سرکاری اَفواج کے ہاتھوں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے تمام ساتھی قتل ہوگئے۔ ان میں دس سے زیادہ نوجوان ان کے گھر کے تھے۔ ایک تیر آکر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اس معصوم بچے کو لگا جو ان کی گود میں تھا۔ آخر کار حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی بڑی دلیری سے لڑتے لڑتے شہید ہوگئے۔ قاتلوں نے اس بوسیدہ چادر کے سوا آپ کے باقی کپڑے اتار لیے جو آپ نے ستر کی حفاظت کے لیے کپڑوں کے اندر پہنی تھی، اور سر مبارک کو بدن سے جدا کر دیا۔ إِنَّا لِلّٰهِ وإِنَّآ إِلَيْهِ رَاجِعُوْن

معرکۂ کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ۷۲/ اَفراد شہید ہوئے جن کے سر قلم کر دیے گئے۔ ان میں سے ۱۸/ اَفراد بنوہاشم کے تھے۔ عمر بن سعد کی فوج کے ۸۸/ آدمی مارے گئے تھے۔

قاتل سنان بن انس حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کٹا ہوا سر لے کر کوفہ کے قصرِ امارت پہنچا اور

عبیداللہ بن زیاد کو خوشخبری دیتے ہوئے یہ فخریہ اشعار پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے:

''میرے اونٹوں کو سونے چاندی سے بھر دے، کہ میں نے اس بادشاہ کو قتل کر ڈالا جو پردے میں رہتا تھا۔

میں نے دنیا کے بہترین والدین کی اولاد کو قتل کیا، جو نام ونسب کے شمار کے وقت سب سے اعلیٰ شمار ہوتا تھا۔''

سر مبارک کو ایک طشت میں رکھ کر عبید اللہ بن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بالوں میں خضاب لگا ہوا تھا۔ سنگ دل ابنِ زیاد نے چھڑی سے ان کے بالوں کو کریدتے ہوئے کہا: دیکھو! ابو عبداللہ کے بالوں میں سفیدی آگئی۔

پھر چھڑی کو ہونٹوں پر رکھ کر طنزیہ انداز میں کہا: دہن تو بڑا خوبصورت ہے۔

اِس وقت کوفہ کے بزرگ اور شرفاء مجلس میں موجود تھے۔ ان میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ بول اٹھے: واللہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں بوسے دیتے دیکھا ہے جہاں تم نے چھڑی رکھی ہے۔

قافلے میں شامل خانوادۂ اہلِ بیت کے تمام مرد شہید کر دیے گئے تھے۔ صرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بیٹے علی بن حسین (جو زین العابدین کے لقب سے مشہور ہوئے) اس لیے زندہ رہ گئے تھے کہ وہ بیمار تھے اور لڑائی کے لیے خیمے سے باہر نہیں نکل سکے تھے۔ جب وہ قافلے کی خواتین کے ساتھ کوفہ پہنچے تو ابنِ زیاد نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ: ''اسے بھی قتل کر دو۔ ان کی پھوپھی زینب بنت علی بڑی جرات مند خاتون تھیں۔ وہ زین العابدین سے لپٹ گئیں اور بولیں: ''جب تک مجھے قتل نہ کر دو، اسے نہیں مار سکتے۔'' عبیداللہ بن زیاد نرم پڑ گیا اور انہیں چھوڑ دیا''۔

پھر اس نے قافلۂ حسینی کا سامانِ سفر تیار کر کے انہیں یزید کے پاس دمشق بھیج دیا۔ یزید نے اس سانحے پر افسوس کا اظہار کیا اور کچھ دنوں بعد اہلِ بیت کی مدینہ منورہ واپسی کا انتظام کر دیا۔

سانحۂ کربلا کی ذمہ داری کس پر؟

واقعۂ کربلا کا تفصیل سے جائزہ لینے سے واضح ہوتا ہے اس کے ذمہ دار متعدّد لوگ تھے۔ ان میں سے کسی کی سازش، کسی کی نادانی کسی کی بزدلی کسی کی ضد اور کسی کے جوش انتظام نے حالات کو یہاں تک پہنچایا کہ رسول اللہ ﷺ کی آل و اولاد کا پاک خون بڑی بے دردی سے بہا دیا گیا۔ ذیل میں ہم ان ذمہ داروں کا مختصراً ذکر کرتے ہیں:

(۱) عراقی جنہوں نے مدد نہ کی: سانحۂ کربلا کی ذمہ داری عراق کے ان شہریوں پر بھی عائد ہوتی ہے جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو وعدے کر کے بلایا مگر ان میں سے کچھ شروع ہی سے سازشی اور فریبی تھے اور کچھ غیر مستقل مزاجی اور بزدلی کے باعث کچھ کرنے کی ہمت نہ کر پائے۔ سیّدہ اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کو جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ملی تو فرمایا: اللہ ان لوگوں کو ہلاک کرے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دھوکا دیا۔ ان پر اللہ کی لعنت ہو۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کسی عراقی نے احرام کی حالت میں مچھر کے خون کر دینے کا مسئلہ پوچھا تو آپ نے حاضرین سے کہا: ”اسے دیکھو تو سہی! مجھ سے مچھر کے خون کا مسئلہ پوچھ رہا ہے جب کہ ان لوگوں نے نبی ﷺ کے فرزند کو قتل کیا ہے اور میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ: ”یہ دونوں (حسن و حسین) دنیا میں میرے دو پھول ہیں۔“

مگر یہاں پر یہ یاد رہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اس لعنت ملامت میں عراق کا حاکم ابنِ زیاد عراق کا سپہ سالار عمر بن سعد، وہ عراقی جو سرکاری فوج میں بھرتی ہو کر اہلِ بیت پر حملہ آور ہوئے اور وہ سازشی شہری جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلا کر پھر ابنِ زیاد سے مرعوب ہو گئے یا وہ

شہری جو شروع ہی سے بدنیت یا سازشی تھے سبھی شامل ہیں۔

بعض لوگ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اس مذمّت وملامَت کا مصداق صرف کوفہ کے شہریوں کو قرار دے کر کوفہ کا انتظام سنبھالے ہوئے یزید کے امراء اور اَفسران وسپاہ کو بے قصور باور کرتے ہیں۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی جلسے میں علماء بیان جاری کریں: ”ہم اہل فلسطین پر اسرائیلیوں کے مظالم کی مذمت کرتے ہیں۔“ تو کوئی احمق اس سے یہ استدلال کرے کہ تمام جرم اسرائیلی شہریوں کا ہے جب کہ صہیونی حکومت اور فوج بے قصور ہے کیوں کہ علماء نے اسرائیلیوں کی مذمت کی ہے، صہیونی حکومت یا صہیونی افسران وسپاہ کی صراحت نہیں کی۔

(۲) عمر بن سعد: عمر بن سعد بھی اس سانحے کا بڑا ذمہ دار تھا کیوں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر حملہ آور فوج کی کمان اس کے ہاتھ میں تھی۔ اگرچہ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف کسی کارروائی میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا مگر عبید اللہ بن زیاد کی دھمکیوں اور رئے کی صوبہ داری کے لالچ نے اسے اس مہم پر آمادہ کر دیا۔

(۳) عبید اللہ بن زیاد: عبید اللہ بن زیاد نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ایک باغی مجرم کی حیثیت دی اور کسی احتیاط اور رعایت کا مظاہرہ کیے بغیر ان کے خلاف کارروائی کا حکم دیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کٹا ہوا سر دیکھ کر بھی اس کا دل نہ پسیجا بلکہ اس کے تاثرات ایسے تھے جیسے کوئی روز کا معمول انجام دیا گیا ہو۔ اس ظلم میں سب سے گھناؤنا کردار اسی کا ہے۔

(۴) یزید بن معاویہ: یزید اس سانحے کے وقت حکومت کے مقتدر ترین عہدے پر تھا۔ اس سانحے پر بس اظہارِ غم ہی کیا، عبید اللہ بن زیاد اور کوفہ کے حکام کو برا بھلا کہنے کے سوا کچھ نہ کیا۔ ان میں سے کسی کو سزا دینا تو درکنار نمائشی طور پر معطل تک نہ کیا۔ درحقیقت یزید کی

طرف سے دیے گئے اعتماد اور اختیار نے ہی ابنِ زیاد کو حوصلہ بخشا کہ وہ اتنا گھناؤنا کام کرے کہ جس کی کوئی تلافی ممکن نہ تھی۔ پھر یہ بھی ثابت ہے کہ اس جرمِ عظیم کے بعد ابنِ زیاد کے گمان کے عین مطابق یزید نے اس کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی کی نہ باز پرس۔ پس یزید کو اس سانحے سے بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

(بعض حضرات نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ میں ابن زیاد، عمر بن سعد اور کوفہ کے سپاہ کا کوئی عمل دخل نہیں تھا، اور نہ یزید کسی طرح کا قصور وار تھا، بلکہ آپ کو شہید کرنے والے کوفہ کے وہ شہری تھے جو شیعیانِ علی کہلاتے تھے یہ بات عقل و نقل سے بعید ہے۔)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عظیم قربانی:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قربانی عظیم تھی کیوں کہ صدیوں کے تجربات تواتر کے ساتھ ثابت کرتے آئے ہیں کہ اُمّت کے لیے وسیع البنیاد شورائیت اور غیر موروثی حکمرانی کا وہی ماحول بہتر تھا جو خلافت راشدہ کا مایۂ امتیاز تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی جدوجہد کا مقصد اس معیار کی بازیافت تھا۔ اس محور سے انحراف یزید کے دور میں شروع ہوا اور بعد میں بتدریج بڑھتا گیا۔

یوں حکمرانوں کی مطلق العنانی اور موروثی طرز سیاست نے بڑے بڑے فتنوں اور تباہ کاریوں کو جنم دیا۔

سانحۂ کربلا؛ اسباقِ تاریخ:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سانحۂ شہادت سے جہاں دل صدمے سے پارہ پارہ ہوتے ہیں وہاں قضا و قدر اور تکوینی حکمتوں کا عقیدہ ہمیں صبر و برداشت کا سبق دیتا ہے۔ اس حادثے کے پس پردہ کیا حکمتیں تھیں؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم ان کا احاطہ نہیں کرسکتے۔ تاہم غور و فکر

سے چند حکمتیں بہت واضح دکھائی دیتی ہیں:

(۱) اللہ جانتا تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کو کچھ لوگ مافوق الفطرت ہستیاں گمان کر لیں گے، انہیں غیب دان، حاجت رَوا اور مشکل کُشا ماننے لگیں گے، واقعۂ کربلا ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے ایک دلیل بن سکتا ہے کہ اگر حسین رضی اللہ عنہ غیب دان، حاجت رَوا اور مشکل کُشا ہوتے تو اس طرح مظلومانہ حالت میں شہید نہ کر دیے جاتے بلکہ ان کے ایک اشارے سے تمام معاملات حل ہو جاتے۔

(۲) حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اس جدو جہد کا ہر ورق انسان کو ملّتِ اسلامیہ کے اجتماعی مفادات کے لیے کھڑے ہونے، خطرات مول لینے اور جان کی بازی لگانے کا لازوال درس دیتا ہے۔

(۳) یہ سانحہ ماتم کا نہیں صبر و تحمل کا سبق سکھاتا ہے۔ ناقابلِ برداشت مصائب اور ناگہانی آفات کے وقت سوچ لینا چاہیے کہ اللہ کے امر اور تقدیر کے سامنے حسین رضی اللہ عنہ جیسے عالی مرتبہ انسان کو شہید ہونا پڑا تو ہم کیا چیز ہیں۔

(مختصر از: آئینۂ تاریخِ اُمّت اور تاریخ اُمّتِ مسلمہ: مؤلفہ مولانا اسماعیل ریحان)